گنجینۂ غالب

غالب آج کل میں

۲



پبلیکیشنز ڈویژن

گنجینۂ غالب

پبلی کیشنز ڈویژن

پہلی بار : فروری ۱۹۶۹ء
دوسری بار : دسمبر ۱۹۹۵ء

First Published : February 1969
Reprint : December 1995

Ganjina-e-ghalib
ISBN : 81-230-0340-4

خوشنویس: عتیق احمد

ناشر: ڈائرکٹر پبلی کیشنز ڈویژن، وزارت اطلاعات ونشریات، حکومت ہند،
پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

سیلز ایمپوریا • پبلی کیشنز ڈویژن

- سپر بازار (دوسری منزل) کناٹ سرکس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱
- کامرس ہاؤس، کریم بھائی روڈ، بلارڈ پائر، بمبئی ۴۰۰۰۳۸
- ۸۔ ایسپلینڈ ایسٹ، کلکتہ ۷۰۰۰۶۹
- ایل ایل۔ آڈی ٹوریم، ۷۳۶۔ انا سلئے، مدراس ۶۰۰۰۰۲
- بہار سرکار کوآپریٹو بلڈنگ، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴
- نزد گورنمنٹ پریس، پریس روڈ، تری ویندرم ۶۹۵۰۰۱
- ۱۰۔ بی، اسٹیشن روڈ، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۴
- سٹیٹ آرکیالاجیکل میوزیم بلڈنگ، پبلک گارڈن، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۴

Printed at Sheel Print-n-Pack, Delhi 110032

عرضِ مرتب

"آج کل" کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ اس میں وقتاً فوقتاً غالب سے متعلق مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ یہ مضامین غالب کو سمجھنے اور غالب پر کام کرنے والوں کے لیے بڑے ممدو معاون ثابت ہوتے۔ ہم سے بارہا یہ تقاضہ کیا گیا کہ ہم ان مضامین کا انتخاب شائع کریں۔ لہٰذا غالب سے متعلق ۲۲ مقالوں کا انتخاب "آئینۂ غالب" کے نام سے ۱۹۶۴ء میں شائع کیا گیا، جس کو علمی و ادبی حلقوں میں سراہا گیا۔ یہ کتاب اس سلسلے کی دوسری کڑی ہے جو "گنجینۂ غالب" کے نام سے صد سالہ یادگار غالب کے موقع پر شائع کی جا رہی ہے۔ اس مجموعے میں ۲۱ مضامین شامل ہیں۔

"آئینۂ غالب" اور "گنجینۂ غالب" کے لیے مضامین کا انتخاب کرتے وقت اس امر کو پیش نظر رکھا گیا ہے کہ اس عظیم شاعر کی زندگی اور فن کے تمام پہلوؤں کا احاطہ ہو جائے۔ ان دونوں مجموعوں میں آپ کو ایسے تمام اہلِ قلم نظر آئیں گے جنھوں نے غالب کے سلسلے میں گراں قدر کام کیا ہے۔

— مرتب

ہمیں خوشی ہے کہ باذوق حضرات نے غالب کے سلسلے میں ان دونوں کتابوں کی پذیرائی کی اور دونوں ہی کے پہلے ایڈیشن بہت جلد ختم ہو گئے۔ ان کتابوں کی افادیت اور مقبولیت کو مدِ نظر رکھتے ہوتے ہم "گنجینۂ غالب" کا دوسرا ایڈیشن شائع کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے "آئینۂ غالب" کا بھی دوسرا ایڈیشن شائع ہو کر منظرِ عام پر آ چکا ہے۔

۱۹۶۹ء کے بعد سے آج تک غالب کے سلسلے میں "آج کل" میں جو مضامین شائع ہوتے ہیں، ان کا انتخاب بھی ہم "سفینۂ غالب" کے نام سے شائع کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ یہ کتاب بھی بہت جلد منظرِ عام پر آ جائے گی۔

— ناشر

فہرست

امتیاز علی عرشی

کچھ غالب کے بارے میں

میرزا غالب اردو شاعروں میں سب سے زیادہ خوش بخت ہیں کہ ان کے متعلق ہر سال ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اگلی سطروں میں اپنی تازہ دریافت پیش کرتا ہوں، تاکہ غالب دوست اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

(۱)

نواب محتشم الدولہ غوث محمد خاں بہادر شوکت جنگ والی جاورہ نے ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۲ء) میں ہندوستان کی سیر و سیاحت کی تھی۔ ان کی روداد سفر مذکورہ صدر سال کے اندر ہی ریاست کے سرکاری مطبع سے مصور شائع ہوئی تھی۔ یہ "سیر المحتشم" کے نام سے موسوم ہے اور مورخین کے مطالعے کی حقدار ہے۔

نواب صاحب نے شعرائے دہلی میں سے میرزا غالب، امام بخش صہبائی اور ذوق کا ذکر کیا ہے۔ غالب کے بارے میں ان کا بیان حسب ذیل [۱] ہے:

"شاہجہاں آباد میں شعرا بھی بہت ہیں۔ ہر ایک اپنے اپنے انداز خوش بیانی اور طرز شیریں کلامی میں ہلالی و زلالی اور فیضی و عرفی ہے۔ مگر میرزا اسعد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ کمال سخنوری میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ اگر رودکی اس زمانے میں ہوتا تو اپنے دیوان کو رود اشک ندامت میں دھوتا۔ اگر آذری ان کے کلام روشن کو دیکھتا تو آتش غیرت سے اپنی تصنیفات کو جلا دیتا۔ حقیقت میں ان کا ہر مصرع، مصرعہ ہلال آسمان سے بلند تر ہے اور ہر بیت، بیت

۱۔ سیر المحتشم۔ ۲۳۳—۲۳۶

ابروئے خوباں سے خوب تر۔ معانی دقیق گویا تنگی دہان غنچہ دہناں اور مضمون باریک موئ میان نازک بدناں، خیالات میرزا اجلال ان کے دام زلفِ خیال بندی میں سراپا اسیر، اور معانی بلند پرواز بیدل ان کی نظم مسلسل میں پا بہ زنجیر۔ نثر گہر بار نصیرائے ہمدانی ان کی عبارت پر بشارت کے آگے معترف بہیچدانی۔ چار عنصر میرزا بیدل ان کے فقرات موزوں کے روبرو نامعتدل۔ انشائے وحید وابوالفضل ان کے رقعات بے بدل کے مقابل میں ذلیل ومبتذل۔ یہ شعر انہیں کے ہیں: نظم

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد
خوں ہے دل خاک میں احوال بتاں پر یعنی
ان کے ناخن ہوئے محتاج حنا میرے بعد
کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق
ہے مکرر لبِ ساقی سے (۱) صلا میرے بعد

ایضاً

(۲) دل جگر تشنۂ فریاد آیا   پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسد   سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

ولہ

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں   ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں
تیری فرصت کے مقابل اے عمر   برق کو پابحنا باندھتے ہیں

ولہ

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

۱۔ دیوان میں "سے" کی جگہ "میں" ہے۔ عرشی   ۲۔ دیوان میں یہ مطلع کا دوسرا مصرع ہے۔ عرشی

ولہ

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

ولہ

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

وہ گھر میں آئے ہمارے خدا کی قدرت ہے[1]
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں"

اس اقتباس میں غالب کا تقابل فارسی کے استادوں سے کیا گیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ خود نواب صاحب کی نظر میں یا جن اصحاب نے انہیں معلومات بہم پہنچائی تھیں ان کی نظر میں غالب اردو کے نہیں فارسی کے ممتاز ادیبوں اور شاعروں کے ہم پلہ تھے۔

(۲)

رضا لائبریری میں "نگارستان سخن" نام کا ایک مجموعہ اشعار محفوظ ہے۔ جس کا ایک بڑا حصہ امو جان دہلوی کے مطبع احمدی میں چھپا ہے۔ اس کتاب کا ہر صفحہ تکالمہ ہے۔ جس میں بالترتیب ذوق، غالب اور مومن کی غزلیں درج کی گئی ہیں۔

صفحہ ۱۶۱ تک یہی ترتیب نظر آتی ہے۔ صرف ایک جگہ غلطی سے ترتیب بدل گئی ہے۔ یعنی صفحہ ۸۷ پر مومن کی جگہ غالب کی غزل اور صفحہ ۸۸ پر غالب کے نام سے مومن کی غزل لکھی گئی ہے۔

صفحہ ۱۶۲ پر ذوق کا کلام ختم کر کے ظفر شاہ کے سہرے کا عنوان تحریر کیا گیا ہے۔ اسی صفحہ کے دوسرے کالم میں غالب کا قطعہ:

نصرۃ الملک بہادر مجھے بتلا کہ مجھے
تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات کی ہے

۱۔ دیوان غالب میں ہے" وہ آئے گھر میں ہمارے" — عرشی

ختم کر کے ذوق کے سہرے کا عنوان درج کیا گیا ہے۔

صفحہ ۱۶۳ پر ظفر، ذوق اور غالب کے سہرے پہلو بہ پہلو مندرج ہیں۔
صفحہ ۱۶۴ کے وسط میں سہرے ختم ہو کر حسب ذیل خاتمہ شروع ہوتا ہے:

"الحمدللہ والمنہ کہ بعین تائید ایزد ومنان انتخاب دیوان ہر سہ شعرای جادو بیان شہسواران عرصۂ سخندانی شہریاران شہرستان نکتہ رانی، کہ گوئی سبقت از قدماو متاخرین ربودہ وعلم استادی درمیدان فصاحت وبلاغت افراشتہ اند۔

اولاً کلام معجز نظام خداوندی سخن، خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق استاد حضور والا، ثانیاً طوطی شکرستان معانی، چراغ افروز شبستان زبان دانی نجم الدولہ دبیر الملک میرزا اسد اللہ خاں غالب نظام جنگ بہادر۔

ثالثاً فلاطون دوران، سحبان زماں، حکیم محمد مومن خاں تخلص مومن دریں چند اوراق حسب فرمائش لالہ جے نرائین صاحب سوداگر کتب در مطبع احمدی واقع شاہدرہ دلہائی۔ بحسن اہتمام میرزا امو جان حلیہ انطباع پوشید۔ بتاریخ بست ہفتم صفر ۱۲۷۹ ہجری تمام شد"

صفحہ ۱۶۵ سے مومن، غالب اور ظہیر کے قصائد شروع ہوتے ہیں۔ مومن کے قصائد صفحہ ۱۷۴ پر ختم ہوتے ہیں اور اسی صفحے سے ان کا مخمس حافظ شیرازی کی غزل پر۔

آں کہ از سنبل او غالیہ تابی دارد
باز با دلشدگان نازو عتابی دارد

درج کیا گیا ہے جو صفحہ ۱۷۶ پر تمام ہوتا ہے۔

غالب کے قصیدے ۱۷۵ پر ختم ہوتے ہیں اور فوراً بعد ان کا قطعہ ہے — چارشنبہ آخر ماہ صفر چلو رکھ دیں چمن میں بھر کے مئے مشکبو کی ناند۔ شروع ہو کر صفحہ ۱۷۶ پر ختم ہو جاتا ہے۔

ظہیر کا قصیدہ صفحہ ۱۷۳ پر ختم ہوتا ہے۔ صفحہ ۱۷۴ تا صفحہ ۱۷۶ پر ان کی یہ غزل مندرج ہے۔

علائق سے وارستہ انساں نہیں   گلوگیر کس کا گریباں نہیں

نیز اسی صفحہ ۱۷۶ پر "نگارستان سخن" کا بھی خاتمہ ہوتا ہے۔
پہلے ظہیر کے متعلق یہ کہتا چلوں کہ ان کے قصیدے کا عنوان ہے:
"قصیدہ فقیر سراپا تقصیر ظہیر الدین مولف تذکرہ ہٰذا کمترین از
تلمیذان شیخ محمد ابراہیم ذوق۔ در مدح حضور لامع النور بہادر شاہ بادشاہ"۔
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ظہیر کسی تذکرے کے مولف ہیں اور اس تذکرے میں انہوں نے یہ قصیدہ درج کیا ہے، اور وہاں سے "نگارستان سخن" میں نقل کر لیا گیا ہے۔ مگر میری دانست میں یہاں "تذکرہ" بجائے "مجموعہ" لکھا گیا ہے۔ اور ظہیر اسی "نگارستان سخن" کے مولف و مرتب ہیں ۔ واللہ اعلم ۔ نیز ظہیر کا یہ قصیدہ جس کا مطلع ہے:

کہاں تلک ہوں رقم جورِ چرخِ ناہنجار
کہ ایک خلق ہے ہاتھوں سے اس کے سینہ فگار

۸۱ شعروں پر مشتمل ہے اور ان کے دیوان مطبوعہ میں موجود نہیں ہے۔
اسی طرح ان کی مذکورہ بالا غزل ۲۴ شعروں کی ہے۔ دیوان میں ظہیر نے صرف ۱۴ شعر انتخاب کر کے لکھے ہیں۔ ان چودہ شعروں میں سے کئی کے اندر لفظی ترمیمیں بھی کی ہیں۔ جو شعر ترک کر دیے گئے ہیں وہ یہ ہیں:

فلک سوز گر آہ سوزاں نہیں — تو کیا نالہ بھی آتش افشاں نہیں
محبت کی تھی ساری پردہ دری — ہوا چاک یوسف کا داماں نہیں
مجھے مسند جم ہے، فرش حصیر — تمنائے تخت سلیماں نہیں
ثباتِ گلستاں پہ ہنستا ہے یہ — لب غنچہ بے وجہ خنداں نہیں
جو رونا ہے تجھ کو تو تھم تھم کے رو — یہ گریہ ہے اے چشم طوفاں نہیں
مری شور بختی ہے اور داغ دل — بلا سے نہ ہو گر نمکداں نہیں

ق

جہاں میں بس اب جی کے کیا کیجیے — کوئی جی بہلنے کا ساماں نہیں
وہ اگلی سی وحشت وہ جوش جنوں — وہ سر اور وہ سنگ طفلاں نہیں
وہ رمز و کنایہ وہ شعر و سخن — وہ ہم بزم بزم یاراں نہیں
کہاں ہم ظہیر اور فکر غزل — جز ایمائے داغ سخنداں نہیں

جیسا کہ ابھی صفحہ ۱۶۴ کے خاتمے میں گزر چکا ہے، مرتب نگارستان نے ذوق، غالب اور مومن کے کلام کا انتخاب چھاپا ہے۔ مگر غالب کا دیوان خود ہی منتخب اور مختصر تھا۔ اس لیے اس کا بہت بڑا حصہ اس مجموعے میں سما گیا ہے۔ اتنا بڑا کہ ہم اسے مطبع احمدی کا دوسرا ایڈیشن کہہ سکتے ہیں۔

غالب کا متروکہ کلام حسب ذیل ہے۔

(الف) قصائد میں سے دو قدیم قصیدے:

۱۔ ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بیکار
۲۔ دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں

(ب) مثنوی در صفت انبہ

(ج) قطعات میں سے حسب ذیل ۱۳ قطعے:-

۱۔ گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری
۲۔ کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
۳۔ ہے جو صاحب کے کف دست پہ یہ چکنی ڈلی
۴۔ نہ پوچھ اس کی حقیقت حضور والا نے
۵۔ منظور ہے گزارش احوال واقعی
۶۔ اے شاہ جہانگیر جہاں بخش جہاں دار
۷۔ افطار صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو
۸۔ اے شہنشاہ آسماں اورنگ
۹۔ ہے یہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے
۱۰۔ سہل تھا مسہل، ولے یہ سخت مشکل آپڑی
۱۱۔ خجستہ انجمن طوے میرزا جعفر
۱۲۔ ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی
۱۳۔ گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں

(د) رباعیاں کل متروک ہیں۔

(ہ) غزلیات میں سے متروکہ اشعار حسب ذیل ہیں۔

۱۔ سرمۂ مفت نظر ہوں الخ ۔ ۲ شعر
۲۔ غافل بہ وہم ناز خود آرا ہے ورنہ یاں ۔ ۵ شعر
۳۔ جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا ۔ ۷ شعر
۴۔ لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی ۔ ۲ شعر
۵۔ عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا ۔ ۷ شعر
۶۔ آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد ۔ ۱ شعر
۷۔ جہاں میں ہوں غم و شادی بہم ہمیں کیا کام ۔ ۱ شعر
۸۔ نشۂ رنگ سے ہے واشد گل ۔ ۱ شعر
۹۔ قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہمسفر غالب ۔ ۱ شعر
۱۰۔ ڈالا نہ بیکسی نے کسی سے معاملہ ۔ ۱ شعر
اس طرح غزلوں کے ۲۵ شعر چھوڑ دیے گئے ہیں۔

جہاں تک اس نسخے کی صحت کا تعلق ہے، یہ احمدی کے مطبوعہ نسخے سے بدتر ہے۔ اتنا بدتر کہ اگر غالب کے علم میں آجاتا تو اپنا سر پیٹ لیتے۔ چونکہ غالب نے کہیں اس ایڈیشن کا ذکر نہیں کیا ہے اور یہ ممکن نہیں کہ دہلی میں امو جان کے اہتمام سے ان کا کلام شائع ہوا اور وہ باخبر نہ ہوں۔ اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ ان کا اس ایڈیشن کا کہیں ذکر نہ کرنا اس کی ناپسندیدگی کی بنا پر ہو۔

دیوان غالب، احمدی ایڈیشن اور "نگارستان سخن" کا مطبع ہی نہیں، کاتب بھی ایک ہے۔ نیز اس میں چند کو مستثنیٰ کر کے باقی وہ سب غلطیاں بھی موجود ہیں، جو احمدی ایڈیشن کے غلط نامے میں مذکور تھیں، اور اسی لیے انہیں بآسانی دور کیا جا سکتا تھا۔ نیز اس میں سیکڑوں اور کتابت کی غلطیاں بھی کی گئی ہیں۔ ذیل میں صرف ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جو قابل افسوس ہیں۔

(الف) اس نسخے میں حسب ذیل مصرعے چھوڑ دیئے گئے ہیں،
۱۔ ہیں گرفتار وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا
۲۔ تم کو بے مہری یاران وطن یاد نہیں
۳۔ مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

۴۔ راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

(ب) حسب ذیل مصرعوں میں کاتب نے شاید بزعم خود اصلاحیں کی ہیں۔ چونکہ احمدی اور نظامی دونوں میں یہ الفاظ نہیں۔ اس لیے جوان میں غلط نہیں ہیں، وہ بھی غالب کے لفظ نہیں مانے جا سکتے اور اس لیے مرتب دیوان غالب کے لیے روا نہیں کہ انہیں "نسخہ" قرار دے کر اپنے یہاں نوٹ کرے۔

۱۔ پھر غضب کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

دیوان میں "غلط" ہے "غضب" کاتب کی اصلاح ہے۔

۲۔ کام کا ہے مرے وہ دکھ کہ کسی کو نہ ملا

دیوان میں ہے۔ "کام کا میرے ہے جو دکھ"

۳۔ ہر بن مو سے دم فکر نہ ٹپکے خوناب

دیوان میں "دمِ ذکر" ہے۔

۴۔ ہم نے یہ مانا رہے دلی میں پر کھاویں گے کیا

دیوان میں ہے۔ "ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہے"

۵۔ برشکال دیدہ عاشق ہے دیکھا چاہیے

دیوان میں "گریہ عاشق" ہے۔

۶۔ گھستے گھستے مٹ جاتا تم نے کیوں اٹھا ڈالا

دیوان میں ہے "آپ نے عبث بدلا"

۷۔ واں وہ ذوق ناز محو بالش کمخواب تھا

دیوان میں "فرق ناز" ہے۔

۸۔ دل میں اب ذوق وصال یار تک باقی نہیں

دیوان میں "دل میں ذوق وصل و یادِ یار تک باقی نہیں"

۹۔ ذکر میرا بہ بدی بھی انہیں منظور نہیں

دیوان میں "اسے" ہے

۱۰۔ نہیں کہ روز قیامت کا اعتقاد نہیں

دیوان میں "روز" کی جگہ "مجھ کو" ہے

۱۱۔ کوئی کہے کہ شب غم میں کیا برائی ہے

دیوان میں "شب مہ" ہے

۱۲۔ سوائے عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب

دیوان میں ہے "علاوہ عید کے"

۱۳۔ جس کے شانوں پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

دیوان میں ہے "تری زلفیں جس کے بازو پر"

۱۴۔ مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

دیوان میں ہے "مجھ پر پڑیں اتنی"

۱۵۔ وفاداری بشرط استواری عین ایماں ہے

دیوان میں "اصل ایماں" ہے

۱۶۔ غالب نوائے خامہ صریر سروش ہے

دیوان میں ہے "صریر خامہ نوائے سروش"۔

۱۷۔ عمر بھر کا تو نے پیوند وفا باندھا تو کیا

دیوان میں ہے "پیمان وفا"۔

۱۸۔ کیا وہ بھی بے گنہ کش و ناحق شناس ہے

دیوان میں "حق ناشناس" ہے

۱۹۔ اُبھرا ہوا نقاب میں ان کی ہے ایک تار

دیوان میں ہے "نقاب میں ہے ان کی"

۲۰۔ بھاگے تھے ہم بہت سے، اسی کی ہے یہ سزا"

دیوان میں ہے۔ "بہت، سو اسی کی سزا ہے یہ"۔

اغلاط طبع کے تحت یہ بھی قابل ذکر ہے کہ صفحہ ۹۴ پر یہ مطلع لکھا ہے:

گر خاموشی سے فائدہ اخفائے حال ہے

خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

اور بقیہ اشعار صفحہ ۹۶ پر لکھے ہیں۔ اسی طرح دستور کے خلاف صفحہ ۱۰۶ میں

پہلے کالم میں غالب کی غزل درج کردی ہے۔

(۳)

شاہ باقر علی باقر گیاوی بہار کے بہت مشہور صوفی تھے۔ ان کا دیوان فارسی سید عطا حسین صاحب ایم۔ اے (ملازم حیدرآباد) نے ۱۳۵۵ھ (۱۹۳۸ء) میں حیدرآباد سے شائع کیا تھا۔ اس کے دیباچے (صفحہ ۵۰) میں سید صاحب لکھتے ہیں کہ ایک بار حضرت غالب کا دیوان فارسی دیکھ رہے تھے۔ ان کی نظر سے یہ رباعی گزری:

شرط ست کہ بہر ضبط آداب و رسوم   خیزد بعد از نبی امام معصوم
زاجماع چہ گوئی بہ علی باز گرائے   مہ جائے نشینی مہر باشد، نہ نجوم

اس کو پڑھ کر وہ بہت آزردہ ہوئے اور مکدر بیٹھے ہوئے تھے کہ میں اتفاقاً سامنے آگیا۔ مجھے بلایا اور بٹھا کر دیوان میری طرف بڑھایا اور فرمایا "دیکھو تو غالب یہ کیا لکھ دیا۔ کیا یہ صریح تبرا نہیں ہے"۔

حضرت غالب کی شاگردی پر انہیں ہمیشہ فخر رہا اور ان کی مدحت اور ان کے ساتھ اظہار عقیدت میں بیسیوں شعر ان کے دیوان میں نظر آئیں گے"۔ تاہم ان سے ضبط نہ ہو سکا اور اسی وقت اس رباعی کے جواب میں ایک قطعہ لکھا جو اس دیوان میں شریک ہے۔"

دیوان کے صفحہ ۲۹۰ پر یہ قطعہ اس تمہید کے ساتھ درج ہے۔

ایں قطعہ بجواب رباعی حضرت غالب کہ شعر ثانیش این است نوشتہ شد۔

زاجماع چہ گوئی بہ علی باز گرائے

مہ جائے نشینی مہر باشد نہ نجوم

درین شعر اظہار تشیع خود نمودہ اند و انکار اجماع نمودہ حالانکہ اجماع از اصول دین است۔

اصحاب نجوم اند نہ ہر گز ہر کس   اطلاق مہ آمد بہ حدیث نبوی
مہ نیز بود بے خبر از جملہ نجوم   این امر بدیہی است بدانند صبی
زاجماع چو منکر تو شدی ای ناداں   حاصل چہ ز گردیدن تنہا بعلی

(۴)

قاطع برہان کے جواب میں مولوی احمد علی بنگالی نے موئد البرہان لکھی، تو جواب و رد جواب کا ایک طویل سلسلہ قایم ہو گیا۔ امیر مینائی مرحوم نے غالب کی حمایت میں ایک مضمون لکھ کر چھپوایا تو اس کے جواب میں میر آغا علی شمس شاگرد قاضی محمد صادق خاں اختر نے اودھ اخبار شمارہ ۲۶ مورخہ ۲۵ ماہ جون ۱۸۶۷ء میں اس کی تردید کی۔ اس تردید میں آغا نے غالب کے چند اردو شعروں پر بھی اعتراض کیے تھے۔ باقر نے فارسی نثر میں ان کا رد کیا اور خود قتیل پر اعتراض جڑے۔ آغا کا ایک اعتراض یہ تھا کہ غالب نے اپنے موضوع :-

ناف زمین ہے نہ کہ ناف غزال ہے

میں اعلان نون کیا ہے جو درست نہیں۔ اس کا جواب باقر نے یہ دیا (دیوان صفحہ ۲۰۴) کہ اصل میں مصرع یوں تھا۔

ناف زمیں ہے یہ نہ کہ ناف غزال ہے

مطبوعہ نسخے کے کاتب نے لفظ "یہ" کو جو لفظ "نہ" کی تجنیس ہے مکرر جان کر حذف کر دیا ہے اور مصرع دیوان میں غلط چھپ گیا۔ ورنہ یہ غلطی تو مبتدی بھی نہیں کر سکتے چہ جائیکہ رئیس المنتہین۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ غالب کے تمام قلمی و مطبوعہ نسخوں میں "زمین" باعلان نون ہی ہے۔ اسی لیے باقر کا یہ جواب کسی طرح درست نہیں۔ اگر یہ غلطی ہے تو ان کے استاد رئیس المنتہین سے یقیناً سرزد ہوئی ہے۔

(۵)

باقر نے غالب کے ایک اور اردو شعر کا مطلب بھی بیان کیا ہے۔ میں اسے سید عطا حسین صاحب کے دیباچے (صفحہ ۱۵۱) سے خود انہیں کے الفاظ میں نقل کرتا ہوں :

"مولوی سید اقبال علی بحر مرحوم کے چھوٹے بھائی سید خورشید علی مرحوم ایک

روز پٹنہ میں حضرت باقر سے ملنے آئے۔ اثنائے گفتگو میں انہوں نے کہا کہ غالب کے اردو دیوان میں بعض شعر ایسے ہیں جو مہمل اور بے معنیٰ ہیں اور جنہیں انہوں نے غالباً مدہوشی کی حالت میں کہدیا ہو گا۔ فرمایا ایسا کوئی شعر پڑھیے۔ انہوں نے یہ شعر پڑھا:

دل خوں شدۂ کشمکش حسرت دیدار
آئینہ بدست بت بدمست حنا ہے

سن کر پہلے تو اس شعر کی دیر تک تعریف کرتے رہے۔ اس کے بعد اس کا مطلب ایسے لطیف اور دل کش طریقے پر بیان کیا کہ جتنے وہاں بیٹھے تھے نہایت محظوظ ہوئے۔ مجھے ان کے الفاظ بجنسہ یاد نہیں رہے لیکن جو کچھ انہوں نے بیان کیا اس کو میں اپنے الفاظ میں بیان کرتا ہوں۔ فرمایا اسی مضمون کا فارسی کا ایک شعر ایک استاد کا ہے۔ غالب کے شعر سے اس کا مضمون زیادہ صاف ہے اور اس کو سمجھنے کے بعد غالب کے شعر کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں آجائے گا۔ وہ شعر یہ ہے:

مرا جدائی او سوخت، وقت شبنم خوش
کہ در مشاہدۂ آفتاب می سوزد

شاعروں کے تخیل میں شبنم آفتاب پر عاشق ہے۔ جب آفتاب طلوع ہوتا ہے، اس کی تمازت سے شبنم خشک ہو جاتی ہے گویا جل جاتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم بھی جل گئے اور شبنم بھی لیکن جلنے اور جلنے میں فرق دیکھیے کہ ہم تو معشوق کی جدائی میں جل گئے اور خوشا وقت شبنم کا کہ وہ اپنے معشوق کے عین مشاہدے میں اس کی تجلیات کی گرمی سے جلتی ہے۔ اس قسم کے مضمون کو حضرت غالب نے اپنے شعر میں نہایت لطیف پیرایہ میں ادا کیا ہے۔ قاعدہ ہے کہ کسی چیز پر چاروں جانب سے جب نہایت سخت دباؤ پڑتا ہے تو وہ کچل جاتی ہے۔ حنا بھی پس کر خون کی طرح سرخ رنگت پیدا کرتی ہے اور گوری رنگت کا آدمی جب شراب پی کر بدمست ہو جاتا ہے تو اس کا چہرہ بھی خون کی طرح ہو جاتا ہے۔ اس وقت اگر وہ آئینہ ہاتھ میں

لے کر دیکھے تو اس کے چہرے کی سرخ رنگت سے عکس پذیر ہو کر گویا وہ بھی حنائے سائیدہ کی طرح خون جیسا سرخ ہو جاتا ہے۔ حضرت غالب فرماتے ہیں کہ معشوق کے فراق میں اس کے دیدار کی حسرتوں کی یورش اور کش مکش سے عاشق کا دل کچل کر خون ہو گیا ہے۔ اس کے مقابلے میں آئینہ کی خوش نصیبی دیکھیے کہ پسی ہوئی حنا کی طرح خون جیسا ہوا تو وہ بھی، لیکن اس کی یہ حالت معشوق بدمست کے ہاتھ میں جا کر اس کے عین دیدار میں اس کے رخسار کے عکس سے نصیب ہوئی۔ عاشق کے دل کی یہ حالت فراق کی بدولت ہوئی اور آئینہ کی عین وصال اور مشاہدہ رخسار یار کی بدولت۔ باقر کا یہ مطلب تمام شارحین سے الگ ہے۔"

(٦)

کوئی بزرگ سید زمان علی شاہ دفعدار تھے۔ انہوں نے "بوئے خلد" نام کی ایک چھوٹی سی کتاب مرتب کی تھی، جو مختلف شعرا کے منقبتی کلام پر مشتمل ہے اور مطبع یوسفی دہلی میں ۱۳۲۰ھ میں چھپی ہے۔

اس کتاب کے آخر میں (صفحہ ۵٦) انہوں نے بعنوان "لطیفۂ غالب" لکھا ہے کہ مرزا اسد اللہ الغالب (غالب) دہلوی اپنے معمولی شغل میں تھے۔ ناگاہ ایک شخص نے دستک دی۔ معلوم ہوا کہ میر حامد ہیں۔ اندر آنے کی اجازت ہوئی۔ بعد مزاج پرسی حال تشریف آوری دریافت کیا۔ میر صاحب نے عرض کی کہ عرصے سے ایک مصرع کے واسطے متفکر اور متحیر ہوں۔ ہر چند مغز مارتا ہوں لیکن مصرع ثانی موزوں نہیں ہوتا۔ مرزا صاحب نے کمال مہربانی سے پوچھا۔ میر صاحب نے یہ مصرع کہا:

اسپ و زن و شمشیر وفادار کہ دید

مصرع سنتے ہی مرزا صاحب جوش میں آ کر اُٹھ کھڑے ہوتے اور بآواز بلند بڑے جذبے اور شوق سے یہ فرماتے تھے۔ "واللہ علی دید علی دید علی دید" اور بار بار بتکرار خوش ہو کر اچھلتے تھے اور فرماتے تھے:

اسپ و زن و شمشیر وفادار کہ دید   واللہ علی دید علی دید علی دید

میر حامد اس خدا داد لیاقت پر اور حاضر جوابی پر عش عش کر گئے اور خوش و خرم اپنے دولت سرا کو واپس ہوتے۔"

(۷)

غالب نے مطبع نول کشور میں اپنا کلیات فارسی طبع کرانا چاہا تو نواب ضیا الدین احمد خاں بہادر نیر سے ان کا نسخہ طلب کیا۔ انہوں نے کچھ تساہل کیا تو غالب نے لکھا کہ:

"جناب قبلہ و کعبہ۔ آپ کو دیوان کے دینے میں تامل کیوں ہے۔ روز آپ کے مطالعے میں نہیں رہتا۔ بغیر اس کے دیکھے آپ کو کھانا نہ ہضم ہوتا ہو یہ بھی نہیں۔ پھر آپ کیوں نہیں دیتے۔ ایک جلد ہزار جلد بن جاتے میرا کلام شہرت پائے میرا دل خوش ہو، تمہاری تعریف کا قصیدہ اہل علم دیکھیں تمہارے بھائی کی تعریف کی نثر سب کی نظر سے گزرے، اتنے فوائد کیا تھوڑے ہیں۔ رہا کتاب کے تلف ہونے کا اندیشہ۔ یہ خفقان ہے۔ کتاب کیوں تلف ہوگی۔ احیاناً اگر ایسا ہوا اور دلی لکھنؤ کی عرض راہ میں ڈاک لٹ گئی تو میں فوراً بہ سبیل ڈاک رامپور جاؤں گا اور نواب فخر الدین خاں مرحوم کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیوان تم کو لا دوں گا۔ اگر یہ کہتے ہو کہ اب وہاں سے لے کر بھیج دو، وہ کہیں گے کہ وہیں سے کیوں نہیں بھیجتے۔ ہاں یہ لکھوں کہ نواب ضیا الدین خاں صاحب نہیں دیتے تو کیا وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ جب وہ تمہارے بھائی اور تمہارے قریب ہو کر نہیں دیتے تو میں اتنی دور سے کیوں دوں۔ اگر تم یہ کہتے ہو کہ تفضل سے لے کر بھیج دو، وہ اگر نہ دیں تو میں کیا کروں۔ اگر دیں تو میرے کس کام کا۔ پہلے تو ناتمام پھر ناقص۔ بعض بعض قصائد اس میں سے اور کے نام کر دیے ہیں، اور اس میں اسی ممدوح سابق کے نام پر ہیں۔ شہاب الدین خاں کا دیوان جو یوسف مرزا لے گیا ہے اس میں یہ دونوں قباحتیں موجود ہیں۔ تیسری یہ کہ سراسر غلط۔ ہر شعر غلط، ہر مصرع غلط۔ یہ کام تمہاری مدد کے بغیر انجام نہ پائے گا اور تمہارا کچھ نقصان نہیں۔ ہاں احتمال نقصان اور وہ بھی از روئے وسوسہ و وہم، اس صورت میں تلافی کا کفیل جیسا کہ

اوپر لکھ آیا ہوں ... بہر حال راضی ہو جاؤ اور مجھکو لکھو تو میں طالب کو اطلاع دوں اور طالب اس کی جب دوبارہ ہو تو کتاب بھیج دوں۔"

رحم و کرم کا طالب ۔ غالب

(اردوئے معلیٰ ۲۴۲ مطبع اکمل الاخبار دہلی۔ ۱۸۹۱ء)

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے کچھ قصیدے دوسرے ممدوحوں کے نام بھی کر دیتے تھے۔ ہز ہائی نس نواب صاحب لوہارو دام اقبالہم نے ابھی حال میں اپنا ذخیرۂ کتب رضا لائبریری کو عطا فرمایا ہے۔ اس میں غالب کے کلیات فارسی کا ایک مخطوطہ بھی ہے۔ یہ غالب کے پسندیدہ کاتب نواب فخرالدین خاں کے قلم کا نوشتہ ہے۔ سرورق پر نواب الہیٰ کی ۱۸۵۷ء کی تحریر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کے پاس اسی سنہ میں پہنچا ہے۔ اس مخطوطے میں بہت سا کلام حاشیوں میں درج ہے۔ جس کا کچھ حصہ کلیات فارسی میں اور باقی سبد چین میں شائع ہو چکا ہے۔

سبد چین (ص ۳۷ دہلی ۱۹۳۸ء) میں پانچواں قطعہ اس شعر سے شروع ہوتا ہے:

بزم نواب جم حشم مکلوڈ   بوستانے است پر ز نعمت و ناز

یہ قطعہ مخطوطہ لوہارو کے ورق ۱۰ الف پر بھی مندرج ہے۔ مگر اس میں مصرع اول یوں ہے:

چارلس ترولن کہ بزمگہش

اور خط کشیدہ الفاظ خود غالب نے اپنے قلم سے ایک چپی پر لکھے ہیں۔ اس سے غالب کے اس بیان کی تائید ہوتی ہے جو ابھی نواب ضیاء الدین خاں بہادر کے نام خط میں آپ پڑھ چکے ہیں۔

اس مخطوطے کے ورق ۱۲ کے حاشیے پر غالب کا یہ قطعہ خود ان کے اپنے قلم کا لکھا ہوا ہے:

با خرد گفتم از تو فرمائی   شویم از دل خیال بادۂ ناب
گفت صد آفریں ولے نتواں   شستن ایں خیال جز بشراب

یہ قطعہ سبد چین میں چھپ گیا ہے۔

اس مخطوطے میں قطعات وغیرہ سے پہلے نثری عبارتیں بھی ہیں۔ ان میں سے بعض نظموں کے مطالب پر اچھی روشنی ڈالتی ہیں اور اسی لیے یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

۱۔ غالب کا ایک طویل قطعہ ہے:

ایا بکوشش و بخشش رئیس ملت و ملک
ایا بدانش و بینش مدار دولت و دیں

کلیات میں یہ بے عنوان درج ہے اور اس لیے اس کے مخاطب کا تعین دشوار نظر آتا ہے۔

مخطوطہ لوہارو میں اس کا عنوان ہے۔

"در مدح امین الدولہ امداد حسین خاں بہادر وزیر شاہ اودھ" اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ غالب کے مخاطب نواب امین الدولہ لکھنوی تھے۔

۲۔ غالب کا ایک قطعہ تاریخ اس عنوان سے شروع ہوتا ہے۔ "تاریخ تعمیر مسجد امام باڑہ"۔

صحن امام باڑہ و مسجد ہر آں کہ دید
در کربلا زیارت بیت الحرام کرد (۴ شعر)

مخطوطے میں اس کا عنوان ہے "تاریخ اساس پذیرفتن مسجد بمقبرہ قاضی القضاۃ سراج الدین علی خاں مرحوم"۔

۳۔ اس قطعہ کے متصل ہی دوسرا قطعہ ہے۔ جس کا عنوان ہے۔ "تاریخ تعمیر امام باڑہ سراج الدین علی خاں"۔

چوں شد بصحن مدفن خان بزرگوار
طرح امام باڑہ عالی سپہر سا (۵ شعر)

مخطوطے میں اس قطعہ کا عنوان یہ ہے۔

"جنبش قلم بہ نگارش تاریخ تعمیر امام باڑہ کہ در کلکتہ محلہ اشالی بر مزار قاضی القضاۃ قاضی سراج الدین علی خاں مرحوم واقع است"۔

ان دونوں تحریروں سے بڑے کام کی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔

■■

نواب مختار الملک میر تراب علی خاں بہادر سالار جنگ

حضرت اویس قرنی کا نام تاریخ اسلام میں نادیدہ عاشق رسول کی حیثیت سے بہت مشہور و معروف ہے۔ قرن باختلاف روایت یمن کے ایک قریہ (تذکرۃ الاولیا) یا ایک قبیلے (روضۃ الصفا) کا نام ہے۔ حضرت اویس اسی سے منسوب تھے۔ ان کی نویں پشت میں ان کے ایک ہم نام اویس ثالث ہوئے۔ یہ مدینہ کے متولی اوقاف تھے۔ معلوم نہیں کیوں وہ اپنے بیٹے محمد علی کو ساتھ لے کر ہندوستان چلے آئے۔ یہاں ان دنوں بیجاپور کے تخت پر علی عادل شاہ جلوہ افروز تھا۔ دونوں باپ بیٹے اس کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کی خاندانی وجاہت اور علم و فضل کا لحاظ کرتے ہوئے ان کی مناسب آؤ بھگت ہوئی اور ان کے صاحبزادے شیخ محمد علی کو دبیری کا عہدہ عطا ہوا۔

رفتہ رفتہ اس خاندان نے بہت عروج حاصل کیا۔ شیخ محمد علی کے پڑوتے شمس الدین محمد حیدر (بن محمد تقی بن محمد باقر بن محمد علی) نظام علی خاں (نظام الملک آصف جاہ اول کے عہد میں سلطنت دکن کے دیوان مقرر ہوئے۔ حیدر یار خاں بہادر شیر جنگ، منیر الدولہ، منیر الملک ان کے خطاب تھے۔ ۸۰ سال کی عمر تھی جب ۱۷۷۵ء میں انتقال کیا۔ تاریخ ہوئی "حیدر یار خاں عادل" (۱۱۸۹ھ) اورنگ آباد میں دفن ہوئے۔ اس عہد کی تمام تاریخیں ان کی قابلیت اور اوصاف حمیدہ کے بیان سے مملو ہیں۔

شمس الدین محمد حیدر کے دو بیٹے تھے۔ محمد صفدر خاں اور تقی یار خاں۔ تقی یار خاں ۱۷۸۲ء میں لاولد فوت ہوئے۔ بڑے محمد صفدر خاں نے بھی بہت اعزاز و اکرام پایا۔ مختلف اوقات میں نظام کی طرف سے غیور جنگ بہادر، اشجع الدولہ، اشجع الملک، خان خاناں کے خطابات سے سرفراز ہوئے۔ انہوں نے ۱۷۹۰ء (۱۲۰۴ھ)

میں بعارضۂ خفقان انتقال کیا۔ "حشر او می شود باآل رسول" (۱۲۰۴ھ) تاریخ وفات ہے اورنگ آباد میں اپنے والد کے مقبرے ہی میں مدفون ہیں۔ دیگر خوبیوں کے علاوہ فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔

محمد صفدر خاں کی شادی درگاہ قلی خاں سالار جنگ کی دختر نیک اختر بہجت بیگم سے ہوئی۔ اس سے ان کے چار بیٹے ہوئے۔ محمد تقی خاں، حسن رضا خاں، علی زماں خاں، رضا یار خاں — ان میں سے تیسرے بیٹے (علی زماں خاں) کا نکاح ابوالقاسم میر عالم وزیر اعظم دکن کی بڑی صاحبزادی نفیسہ بیگم سے ہوا تھا۔ لیکن جب زچگی میں ان کا انتقال ہوگیا۔ تو میر عالم نے حضور نظام کے ایما سے اپنی دوسری بیٹی صاحبہ بیگم ان کے نکاح میں دے دی۔ میر عالم ہی وہ شخص ہیں جو ٹیپو سلطان شہید کی بربادی کا باعث ہوئے۔ بڑے زیرک اور معاملہ فہم اور کارکن شخص تھے انگریزوں کو ان پر خاص اعتماد تھا۔ حیدرآباد دکن کی متعدد مشہور عمارتیں انہیں کی توجہ بلکہ خرچ پر تعمیر ہوئیں۔ بڑے فاضل شخص تھے۔ نظم و نثر پر پوری قدرت حاصل تھی اور صاحب تصنیف و تالیف تھے۔

میر عالم کی وفات ۱۸۰۸ء (۱۲۲۳ھ) کے بعد ان کے داماد علی زماں خاں بہادر منیر الدولہ، منیر الملک ثانی، امیر الامرا ان کی جگہ دیوان حیدرآباد مقرر ہوئے۔ لیکن "جو چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں"۔ کے مصداق جملہ احکام خود نظام سکندر جاہ بہادر جاری فرماتے اور ریاست کے مالی معاملات میں سیاہ و سپید کے کرتا دھرتا پیشکار مہاراجہ چندو لال بہادر تھے۔ اس لیے ان کی دیوانی محض برائے نام اور گویا انہیں "بدنام" کرنے کا ایک حیلہ بن کر رہ گئی تھی۔ بہرحال یہ پچیس برس تک وزیر ریاست رہ کر ۱۸۳۲ء (۱۲۴۸ھ) میں راہی ملک عدم ہوئے۔ اس کے بعد مہاراجہ چندو لال ہی کو ریاست کی مستقل مدار المہامی کا عہدہ بھی تفویض ہوگیا۔ جس پر وہ گیارہ برس یعنی ۱۸۴۳ء تک فائز رہے۔ معزولی کے بعد ۱۸۴۵ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔

نواب علی زماں خاں منیر الملک ثانی کے اس دوسرے نکاح سے دو بیٹے پیدا ہوئے تھے۔ میر محمد علی خاں اور میر عالم علی خاں۔ یہی میر محمد علی خاں ہمارے

نواب مختار الملک، سالار جنگ بہادر کے والد ماجد ہیں۔

میر محمد علی خاں ۱۸۰۷ء (۱۲۲۲ھ) میں پیدا ہوئے۔ تاریخ ولادت، سید میرزا خاں نے کہی تھی "ستارہ روشن"۔ ان کی مہر کا سجع تھا "بود جانشین محمد علی"۔ خطاب شجاع الدولہ سالار جنگ تھا۔ ان کا نکاح امیر سلطنت سید کاظم علی خاں مختار الدولہ کی صبیہ زینت النسأ بیگم سے ہوا تھا۔ جو سادات نیشاپور میں سے تھے۔ اسی محل سے ان کے ۲ جنوری ۱۸۲۹ء (۲۵ جمادی الثانی ۱۲۴۴ھ) کو وہ بیٹا پیدا ہوا جو آگے چل کر اس سلسلہ زرناب کے لیے بھی باعث صد افتخار و مباہات ثابت ہوا۔ والدین نے اس کا نام نواب علی خاں رکھا۔ خاندان کا دستور یہ تھا کہ نومولود کو سب سے پہلے تبرّکاً کسی عابدہ زاہدہ سیدانی کا دودھ پلواتے تھے۔ یہ پیدا ہوئے تو انہیں ریاست کے ایک معزز منصب دار میر چراغ علی خاں کی بیگم کا جو ہمہ صفت موصوف خاتون تھیں، دودھ پلایا گیا۔ اسی لیے میر چراغ علی خاں کے صاحب زادے میر تہور علی خاں مختار جنگ جلال الدولہ اور نواب سر سالار جنگ دونوں کی ایک ساتھ پرورش ہوئی اور وہ ان کے رضاعی بھائی ہونے کے باعث ان کے کوکہ کہلاتے تھے۔

میر محمد علی خاں کا عہد شباب میں بعمر ۲۵ سال ۱۸۳۲ء (۱۲۴۷ھ) میں انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد نواب علی خاں کی پرورش ان کے جد بزرگوار نواب منیر الملک ثانی نے اپنے ذمہ لے لی، جو ان سے دیوانہ وار محبت کرتے تھے۔ یہ چار برس کے تھے کہ انہیں ایسا شدید تپ کا عارضہ لاحق ہو گیا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ روایت ہے کہ جب سب کو یاس ہو گئی تو نواب منیر الملک نے دعا مانگی کہ بار آلہا اگر اس بچے کی موت مقدر ہی ہے تو اس کی جگہ مجھے اٹھا لے، اور اسے صحت عطا فرما دے۔ نہ جانے وہ کون سی گھڑی تھی جب یہ الفاظ ان کے منہ سے نکلے۔ دعا بارگاہ الٰہی میں مقبول ہو گئی۔ چند دن میں بچہ بھلا چنگا ہو گیا اور نواب منیر الملک ثانی اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

ہونے کو یہ ٹھیک تو ہو گئے لیکن بیماری کا حملہ اتنا شدید تھا کہ اس سے تندرستی بالکل تباہ ہو گئی اور یہ دائمی طور پر نحیف الجثہ اور منحنی ہو کے رہ گئے۔ منیر الملک کی وفات کے بعد ان کی تعلیم و تربیت ان کے چچا میر عالم علی خاں بہادر سراج الملک کی نگرانی میں ہونے لگی۔ چونکہ صحت ٹھیک نہیں رہتی تھی اور اندیشہ تھا کہ مزید بوجھ

پڑنے سے یہ اور خراب ہو جاتے گی، اس لیے ایک زمانے تک ان کی باقاعدہ تعلیم شروع نہ ہو سکی اور یہ گیارہ برس کی عمر تک معمولی شد بد سے آگے نہیں بڑھے. اس کے بعد جب کچھ اچھے ہوئے تو اس پر زیادہ سنجیدگی سے توجہ دی گئی اور انہوں نے اس زمانے کے رواج کے مطابق فارسی اور عربی، حساب کتاب، انشاپردازی اور خوش نویسی کی معقول تعلیم کے علاوہ مردانہ کھیلوں میں بھی خاصی مہارت حاصل کی. چنانچہ نشانہ لگانے اور نیزہ بازی اور شہ سواری میں پورے طاق تھے. خاص طور پر گھوڑے کی سواری کے بہت شائق تھے. بڑے سے بڑے منہ زور گھوڑے پر نڈر سوار ہو جاتے ۔ زمانۂ شباب میں انگریزی زبان حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا تو رفتہ رفتہ اس میں بھی بقدر ضرورت اچھی خاصی واقفیت حاصل کر لی تھی۔

نواب منیر الملک نے وفات کے وقت پچیس لاکھ کا قرض چھوڑا تھا. غفران منزل نواب ناصر الدولہ بہادر آصف جاہ چہارم نے قرضہ تو بے باق کر دیا لیکن ان کی بیشتر متروکہ جائیداد نزول قرار دے دی. اس سے خاندان پر گویا عسیر الحالی کا دور آگیا. نواب سراج الملک اگرچہ اپنے والد کی جگہ مدار المہام ریاست تو ہو گئے لیکن ان کی آمدنی اتنی قلیل تھی کہ ان کے مرتبے کے مطابق داد و دہش کے لیے کفایت نہیں کرتی تھی. لامحالہ انہیں قرض لینا پڑتا تھا. لیکن ساہوکار جانتے تھے کہ اس کی واپسی کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں. اس لیے وہ کافی ضمانت کے بغیر قرض دینے پر راضی نہیں ہوتے تھے. لطیفہ یہ کہ وہ بالعموم مطالبہ کرتے تھے کہ اگر آپ کے بھتیجے میر تراب علی خاں ضامن ہو جائیں، تو ہم قرض دے دیتے ہیں. میر تراب علی خاں اس کم سنی کے باوجود حساب کتاب کے معاملات میں بہت ہوشیار تھے. جب نواب سراج الملک ان سے کہتے کہ تم ضمانت دے دو تو یہ عرض کرتے خاکسار کو بھلا اس میں کیا عذر ہو سکتا ہے لیکن میری التماس یہ ہے کہ جاگیر میں سے کسی علاقے کا انتظام میری تحویل میں کر دیا جائے تاکہ میں اس کی آمدنی سے قرضے کی ادائیگی کا انتظام کر سکوں۔

اس سے دو فائدے ہوتے. اول یہ کہ بہت سا قرضہ بتدریج ادا ہوتا گیا دوسرے انہیں چھوٹی سی عمر میں مالی اور انتظامی معاملات کا غیر معمولی تجربہ حاصل ہو گیا۔

۱۸۴۸ء میں جب نظام نے نواب سراج الملک کو دوبارہ وزارت اعلیٰ پر مقرر کیا تو ان کی خاندانی جائداد بھی واگذاشت کر دی۔ میر تراب علی خاں نے اپنے حسنِ انتظام سے پہلی جاگیر کی دیکھ بھال ایسی عمدگی سے کی تھی کہ چچا دل و جان سے ان کی قابلیت اور کارکردگی کے قائل ہو گئے تھے۔ اب جو انہیں ساری جائیداد واپس ملی تو انہوں نے اسے بھی اپنے ہونہار بھتیجے کے ہاتھ میں دے دیا۔

نواب سراج الملک نے چند دن کی علالت کے بعد ۲۶ مئی ۱۸۵۳ء (۱۷ شعبان ۱۲۶۹ھ) کو لاولد انتقال کیا۔ اس کے دو دن بعد نواب ناصر الدولہ آصف جاہ چہارم نے میر تراب علی خاں کو طلب کیا اور انگریز ریذیڈنٹ کی موجودگی میں انہیں خلعت دیوانی اور سالار جنگ کے خطاب سے مفتخر فرما کر اپنا مدار المہام یعنی وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف چوبیس برس کی تھی۔ میرزا ہمدم شیرازی کے طویل قطعہ تاریخ کے آخری چند شعر یہ ہیں:

فلک رتبہ نواب سالار جنگ
تراب علی، نور چشم جہاں

شہ باستاں میر احمد لوا
سر راستاں آصف جم نشاں

وزیر خردمند دانش پذیر
جوان و جواں بخت، روشن رواں

بجائے نیاگاں بہ مسند نشست
بہ تدبیر پیر و بہ بخت جواں

پئے سال تاریخ ہمدم بگفت
"وزارت مبارک بہ صدر جہاں"
۱۲۶۹ھ

جب یہ مدار المہام ہوتے ہیں تو اس وقت حیدر آباد کی حالت کس درجہ ابتر تھی، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ریاست پر دو کروڑ ستر لاکھ کا سودی قرض تھا۔ اس کے علاوہ عرب جمع داروں کے پاس ریاست کی نصف سالانہ آمدنی (یعنی ۶۵ لاکھ)

کا علاقہ رہن تھا، اور کوئی پندرہ بیس لاکھ سالانہ کی جاگیریں بھی ان ہی جمع داروں کے مستقل قبضے میں تھیں اور مزید کم و بیش تیس لاکھ کے علاقے ٹھیکے پر تھے۔ غرض خزانہ خالی تھا اور روز بروز قرض کی مقدار میں اضافہ ہو رہا تھا۔ فوج اور سپاہ کو مہینوں تنخواہ کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوتا تھا۔ جب یہ لوگ سخت تنگ آجاتے تو "بجنگ آمد" پر عمل کرتے ہوتے شاہی محل پر ہلہ بول دیتے۔ فساد پر آمادہ ہو جاتے اور بغاوت کی دھمکی دیتے۔ لامحالہ اس پر مزید قرض لے کر دو ایک مہینے کی باقی تنخواہ ادا کر دی جاتی تاآنکہ یہ لوگ پھر مرنے مارنے پر تیار نہ ہو جاتے۔

مالی بدحالی کا یہ حال تھا۔ رہا انتظام حکومت تو وہ اس سے بھی بدتر تھا۔ ریاست میں عرب جمع داروں اور روہیلے پٹھانوں کا دور دورہ تھا۔ ان کی شورہ پشتی اور رعایا پر ظلم و ستم کے ایسے ایسے واقعات لکھے گئے ہیں کہ انہیں پڑھ کے حیرت ہوتی ہے۔ ایک عرب نے راہ چلتے ایک شریف آدمی سے کہا کہ صاحب ذرا یہ دستاویز تو پڑھ دیجیے اس نے دیکھ کر کہا، یہ چار سو روپے کا تمسک ہے۔ عرب نے بگڑ کے کہا، واہ خوب آدمی ہے، پانسو کے تمسک کو چار سو کا بتاتا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ اس میں چار سو ہی لکھا ہے۔ اگر اعتبار نہیں تو کسی اور سے پڑھوا لو۔ اس پر عرب نے غیظ و غضب سے کاغذ اس کے ہاتھ سے چھین، پھاڑ کے پھینک دیا، اور اس غریب کے گلے میں رومال ڈال کے کہنے لگا، اچھا چلو اس وقت چار سو ہی ادا کر دو، بقیہ کی پھر دیکھی جائے گی۔ اب تو وہ شخص چیخنے لگا کہ میں نے کب تم سے کچھ لیا ہے۔ لیکن کون سنتا ہے۔ وہ عرب اسے کھینچ کر ساتھ لے چلا۔ آخر بڑی مشکل سے کچھ دے دلا کر گلو خلاصی کرائی۔

ان کے ظلم کا ایک اور افسوس ناک واقعہ سنیے:

احمد علی خاں شہید تخلص منصب دار ریاست تھے۔ ان کی ایک نابالغ بیٹی تھی۔ عربوں کے جمع دار ناصر رستم جنگ نے اپنے بھتیجے کے لیے شہید سے اس کی لڑکی کی خواستگاری کی۔ شہید نے کسی وجہ سے انکار کر دیا۔ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ایک شام ان کے دروازے پر ایک فقیر نے آکے سوال کیا۔ اتفاق سے اس وقت ان کی بیوی اور اس معصوم لڑکی کے سوائے گھر پر کوئی نہیں تھا۔ ماں نے بیٹی سے کہا کہ جاؤ فقیر کو روٹی دے آؤ۔ جب دیر تک لڑکی واپس نہ آئی تو ماں پکارتی ہوئی دوڑی۔ دیکھا

تو لڑکی غائب ہو گئی ہے۔ بہت چیخی چلائی، لیکن بے سود۔ اگلی صبح شہید غریب نے مکان کا دروازہ کھولا تو دیکھا کہ سامنے گلی میں ایک گٹھری پڑی ہے۔ اسے کھولا تو اس میں سے دختر گم شدہ کی لاش کے ٹکڑے ملے۔ کوتوالی گئے، فریاد کی، لیکن اب کیا ہونا تھا۔ کچھ بھی نہ ہوا۔

روہیلے پٹھان بھی ان عربوں سے کم نہ تھے۔ چونکہ یہ لوگ اپنے پیر سلطان میاں کو مہدی زماں مانتے تھے اس لیے مہدوی کہلاتے تھے۔ ان کے تمرد اور سرکشی کا اندازہ اس سے لگایئے کہ ایک دن ان کے پیرزادے کی سواری جن کا محمد نام تھا، حسب معمول بڑی دھوم دھام سے بازار میں جا رہی تھی۔ بلم برداروں اور بھال داروں کا ایک گروہ ان کے جلو میں، ہٹو بچو کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ دوسری طرف سے حضور نظام کے پیش امام مولوی مرتضٰی کے بھتیجے گھوڑے پر سوار آرہے تھے۔ اس شور و شغب سے ان کا گھوڑا چمکا اور کار قضا اس کے پاؤں سے کیچڑ کا ذرا سا چھینٹا اڑ کر پیرزادے صاحب کے دامن پر آپڑا۔ بس غضب ہی تو ہو گیا۔ ان کے اشارہ کرنے کی دیر تھی کہ ایک بلم بردار نے بلم کی نوک سے مولوی زادے کی پگڑی اچھال کر زمین پر پھینک دی۔ یہ غیرت اور غصے کے مارے بے حال ہو گئے اور ساتھ کے خدمت گار سے تلوار لینے کو ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ دوسرے نے تلوار کا ہاتھ مارا جس سے ان کی چار انگلیاں کٹ کے الگ ہو گئیں۔ پھر کیا تھا۔ پیرزادے کے ہمراہی ان پر ٹوٹ پڑے اور تلوار، کٹار، بھلے سے ان کے پرزے اڑا دیتے۔ دارالخلافے میں، دن دہاڑے، عین سر بازار یہ حادثہ پیش آیا اور کوئی ان ظالموں کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔

ہر ایک رئیس نے جمعیت اکٹھا کر رکھی تھی۔ یہ لوگ رعایا پر ظلم و تعدی کرتے اور ان سے جو چاہتے، وصول کر لیتے، اور اگر کوئی انکار کرتا تو اسے کھلے بندوں موت کے گھاٹ اتار دیتے۔ پھر ان کی آپس میں خانہ جنگیاں بھی ہوتی رہتی تھیں۔

غرض ریاست کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اندرونی طور پر کامل خلفشار کا عالم تھا۔ اور باہر نہ اس کی کوئی عزت تھی نہ وقار۔

سالار جنگ نے زمام وزارت ہاتھ میں لیتے ہی سب سے پہلے ریاست

کی مالی حالت کی اصلاح پر توجہ دی کہ دراصل یہی جملہ خرابیوں کی جڑ تھی۔ لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں تھا۔ جن لوگوں کے پاس پشت ہا پشت سے اتنی بڑی بڑی جاگیریں چلی آرہی تھیں، جن کی لاکھوں کی آمدنی سے ان کی حیثیت گویا خود مختار رئیس کی سی ہوگئی تھی، وہ بھلا کیوں اس سے دست بردار ہونے لگے تھے۔ لیکن سالار جنگ نے بہت صبر اور دوراندیشی اور حکمت عملی سے کام لیا۔ کہیں نرمی سے جاگیردار کو رام کیا اور کہیں ضرورت پڑنے پر سختی سے کام نکالا۔ یوں تیرہ برس کے عرصے میں ریاست کا تمام قرض بھی ادا کر دیا، مرہونہ علاقے بھی واگزار ہو گئے، فسادی عناصر کا بھی قلع قمع ہو گیا اور وہی ریاست جس کی نہ گھر میں کوئی ساکھ تھی، نہ باہر پوچھ اب ہندوستان کی سب سے طاقتور ریاست شمار ہونے لگی۔

ان سے پہلے ریاستی کاروبار میں کسی نظم و ترتیب کا پتا ہی نہیں تھا۔ سب کچھ نظام اور ان کے مدارالمہام کی ذاتی رائے پر موقوف تھا۔ اب ریاست کے تمام محکمے سالار جنگ بہادر کی توجہ اور بیدار مغزی سے عالم وجود میں آئے۔ سب سے پہلے خزانۂ عامرہ قائم ہوا۔ پھر لوگوں کو تنخواہ باقاعدگی سے مہینے کے مہینے ملنے لگی۔ اس کے بعد انہوں نے اس کاروبار ریاست کو چار انتظامی شعبوں میں تقسیم کر کے انہیں چار امیروں کے سپرد کیا، جن کی حیثیت گویا وزیروں کی تھی۔ یہ صدر مدارالمہام کہلاتے تھے۔ اس طرح گویا ایک کابینہ مرتب ہو گئی۔ غرض ان کے عہد میں یہ سب کام کاج ایک مہذب اور متمدن نظام کے مطابق ہونے لگا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ سب کچھ بے غل وغش آسانی سے ہو گیا۔ صرف حاسدوں اور فتنہ پردازوں ہی نے قدم قدم پر روڑے اٹکائے ہوتے تو اس سے تعجب نہ ہوتا کیونکہ ان کا مقصد ہی یہ تھا کہ انہیں بدنام کریں اور ناکام بنائیں۔ سب سے بڑی مشکل خود غفران منزل نواب ناصرالدولہ کی تھی۔ سالار جنگ مرحوم جی جان سے چاہتے تھے کہ نہ صرف ریاست میں انگریزی طرز حکومت رائج کیا جائے بلکہ خود انگریزوں سے بھی پورا ربط ضبط اور دوستی کا رشتہ قائم ہو جائے۔ انہیں اس کا پوری دیانت داری سے یقین تھا کہ اسی میں ریاست کی بھلائی ہے۔ دوسری طرف نواب ناصرالدولہ سخت مذہبی قسم کے انسان تھے۔ وہ انگریز اور انگریزی قانون اور انتظام کے نام تک سے بھڑکتے اور برہم

ہوتے تھے۔ جب حکمراں کے یہ خیالات ہوں تو وزیر کی حالت قابلِ رحم کیوں نہ ہو۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سالار جنگ کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا۔ لیکن وہ کسی حال میں بھی مایوس نہیں ہوتے۔ پورے استقلال اور وقار سے اپنی حکمتِ عملی پر قائم رہے اور بتدریج ریاست میں اصلاحات کا نفاذ کرتے رہے۔

غفران منزل نواب ناصر الدولہ کا ۱۸۵۷ء میں انتقال ہوگیا۔ بسترِ مرگ پر انہوں نے اپنے وارث نواب افضل الدولہ (آصف جاہ پنجم) اور وزیر نواب سالار جنگ کو وصیت کی کہ حکومت انگریزی کا برتاؤ ہماری ریاست سے ہمیشہ دوستانہ رہا ہے اس لیے تمہارا فرض ہے کہ تم بھی اس سے وفاداری کا تعلق رکھو۔ جس دن نواب افضل الدولہ گدی پر بیٹھے ہیں، اس دن دلی سے اس ہنگامے کے شروع ہونے کی خبر حیدرآباد پہونچی، جس نے آہستہ آہستہ پھیل کر پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پھر ان دونوں نے جس طرح مرحوم کی آخری نصیحت پر عمل کیا وہ ان کے کردار کی بلندی پر دال ہے۔ انہیں ہر طرح کی دھمکیاں دی گئیں۔ بلکہ دھمکیوں سے گزر کر ان پر واقعی قاتلانہ حملے ہوئے، لیکن ان کے قدم نہیں ڈگمگائے۔ جو راستہ انہوں نے اختیار کیا تھا، اس پر بے خوفی اور مضبوطی سے قائم رہے۔

نواب افضل الدولہ نے تخت نشیں ہوتے ہی انہیں خطاب "مختار الملک" سے سرفراز فرمایا۔ میر احمد علی خاں شہید نے تاریخ کہی۔

بہ نواب سالار جنگ اہلِ حشمت
خطاب و جواہر سزاوار بادا

بہ دل داشتم فکرِ سالِ ہمایوں
خرد گفت "جاوید مختار بادا"

۱۲۷۳ھ

نواب افضل الدولہ کے عہد میں بھی پورا زمانہ یہی مدار المہام رہے۔ خوش اعتقادی اور دینداری میں یہ بھی اپنے والد مرحوم نواب غفران منزل سے کم نہیں تھے۔ اسی لیے ان کی نئی نئی جدتوں سے اکثر جزبز ہوتے، بلکہ معاندوں کی ریشہ دوانیوں کے باعث

برافروختہ اور ناراض تک ہوتے رہتے تھے۔ لیکن انہیں بھی ان کی وفاداری اور خیر خواہی پر کامل اعتماد تھا، اور سالار جنگ نے بھی اپنی جاں فشانی اور اخلاص سے دن رات محنت کر کے ریاست کو چار چاند لگا دیتے تھے۔ ۱۸۵۷ء میں ریاست نے جو رویہ اختیار کیا تھا اس سے انگریزی حکومت ان کی دوستی کی قائل ہو گئی تھی چنانچہ جب ہر طرف امن و امان ہو گیا اور ملک کے سب حصوں پر انگریزی تسلط از سر نو قائم ہو گیا، تو ۱۸۶۰ء میں انگریزوں نے اظہار خوشنودی کے طور پر نواب افضل الدولہ کے لیے ایک لاکھ روپے کے اور مختار الملک کے لیے تیس ہزار روپے کے تحائف ارسال کیے۔ اس کے بعد ۱۸۶۶ء میں مختار الملک کو "سر" کا خطاب دیا۔ پھر ۱۸۷۱ء میں نائٹ گرانڈ کمانڈر آف دی آرڈر اسٹار آف انڈیا (جی۔ سی۔ ایس۔ آئی) کا خطاب اور ۱۸۷۷ء میں ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی پر اکیس توپ کی سلامی کا اعزاز ملا۔ اس کے کچھ عرصے بعد سلطان عبدالحمید خلیفتہ المسلمین نے بھی تمغہ مجیدی درجۂ اول عطا کیا۔

مغفرت مکان نواب افضل الدولہ کا ۱۸۶۹ء میں انتقال ہو گیا، اور ان کے ڈھائی سالہ صاحبزادے میر محبوب علی خاں آصف جاہ ششم ان کے جانشین ہوتے۔ اب مختار الملک کی ذمہ داریاں اور بھی بڑھ گئیں۔ سرکار انگریزی نے ان کے ساتھ نواب شمس الامرا امیر کبیر بہادر کو شریک ریجنٹ مقرر کیا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نواب شمس الامرا نے کبھی ان کے کام پر اعتراض نہیں کیا۔ اور یہ ہر معاملے میں اپنی صوابدید ہی سے فیصلہ کر دیتے تھے۔ جب نواب شمس الامرا کا اپریل ۱۸۷۷ء میں انتقال ہو گیا تو ان کی جگہ نواب رشید الدین خاں وقار الامرا شریک ریجنٹ مقرر ہوتے۔ چار برس بعد دسمبر ۱۸۸۱ء میں وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے، تو اب ان کی جگہ کسی اور کو مقرر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ اب گویا "مختار الملک" اسم بامسمیٰ ہو گئے۔

شروع میں برار کا علاقہ دراصل ریاست حیدر آباد ہی کا حصہ تھا۔ ۱۸۵۳ء میں انگریزوں نے اسے انگریزی فوج متعینہ ریاست کی بقایا تنخواہ کے عوض میں اپنی تحویل میں لے لیا۔ مختار الملک نے مدار المہام مقرر ہوتے ہی اس انتظام کی خرابی محسوس کر لی تھی۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا، تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ جب تک ریاست کی مالی حالت خستہ رہی، اس کی واپسی کی کوشش بھی بے سود تھی۔ جب انہوں نے اپنی مسلسل

مساعی اور اصلاحات سے ریاست کو پھر سے اپنے پاؤں پر کھڑا کر دیا۔ اور انگریزوں پر بھی ثابت ہوگیا کہ حیدر آباد کا نظم و نسق کسی دوسری جگہ سے کم نہیں، تو انہوں نے استرداد برار کی کوشش شروع کر دی۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کو ہندوستان میں جن خطرناک حالات کا سامنا تھا اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ ان ایام میں بھی نواب مختار الملک نے سخت مخالفانہ صورت حال کے باوجود پوری وفاداری اور ثابت قدمی سے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ انہیں توقع تھی کہ انگریز ان کی خدمات کے اعتراف میں برار واپس کر دیں گے۔ لیکن چونکہ اس قضیے کا فیصلہ بہر حال ولایت میں ہونا تھا اور ہندوستان کے حکام محض وہاں کے احکام نافذ کرنے والے تھے اس لیے انہوں نے فیصلہ کیا کہ انگلستان کا سفر کیا جائے اور ذاتی گفت و شنید سے یہ معاملہ طے کرایا جائے۔ حسنِ اتفاق سے ۱۸۷۵ء میں پرنس آف ویلز (جو بعد کو ایڈورڈ ہفتم کے نام سے ملکہ وکٹوریہ کے جانشین ہوئے) ہندوستان کی سیر کو آئے۔ ان کے حاشیہ میں ڈیوک آف سدرلینڈ بھی تھے۔ وہ سیر کے لیے جنوری ۱۸۷۶ء میں حیدر آباد پہنچے اور یہاں نواب مختار الملک کی ملاقات سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے روانگی سے پہلے انہیں انگلستان آنے اور اپنے یہاں مہمان بننے کی دعوت دی۔ یہ تو پہلے ہی سے اس سفر کے لیے پر تول رہے تھے۔ اس دعوت نے گویا سمندِ شوق کے لیے تازیانے کا کام کیا۔ چنانچہ وہ ۸ اپریل ۱۹۷۶ء کو ۵۲ آدمیوں کے قافلے کے ساتھ بمبئی سے جہاز پر سوار ہوئے۔ رستے میں وہ شاہ وکٹر عمانیویل بادشاہ اطالیہ اور پوپ سے ملے اور اس کے بعد اطالیہ کے بعض دوسرے شہروں کی سیر کرتے ہوئے ۱۳ مئی کو پیرس پہنچے۔ ارادہ یہ تھا کہ یہاں صرف ایک دن رک کر آگے روانہ ہو جائیں گے، جہاں مفصل پروگرام پہلے سے بن چکا تھا، لیکن پیرس میں ایک افسوسناک حادثہ پیش آیا جس سے سارا انتظام تلپٹ ہوگیا۔ جس دن یہ یہاں پہنچے ہیں، اسی شام کو اپنی قیام گاہ گرانڈ ہوٹل کی سیڑھیوں سے اترتے ہوئے ان کا پاؤں پھسل گیا، جس سے ہڈی ٹوٹ گئی۔ ان کی بے بسی کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ وہ چلنے پھرنے تک سے معذور تھے۔ اس حالت میں سفر کیونکر ہو سکتا تھا۔ غرض انہیں علاج کے لیے مجبوراً دو ہفتے یہاں رکنا پڑا۔ جب قدرے افاقہ ہوا اور سفر کے قابل ہوئے تو یکم جون کو ایک خاص بحری جہاز پر سوار ہو کر ولایت پہنچے۔ یہاں ان کی جتنی خاطر مدارات اور اعزاز و

اکرام ہوا، اس کا تفصیلی ذکر غیر ضروری ہے۔ ہر جگہ جلسے اور دعوتیں ہوئیں ــــ آکسفورڈ یونیورسٹی کی طرف سے ڈاکٹر آف سول لا۔ (ڈی۔سی۔ایل) کی اعزازی ڈگری ملی۔ لندن کی کاؤنٹی کونسل نے ایک خاص اجلاس میں انہیں آزاد شہری (فریڈم آف دی سٹی آف لندن) کا اعزاز دیا۔ خود ملکہ وکٹوریہ نے ایک دن ونڈسر محل میں مہمان رکھا۔ بے شک یہ سب کچھ تو ہوا لیکن جس مقصد کے لیے انہوں نے اتنا دور دراز کا سفر اور بے شمار خرچ گوارا کیا تھا، اس میں کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ نہ صرف یہ بلکہ اس سے متعلق کوئی گفت گو تک نہ ہو سکی۔ جب انہوں نے وزیر اعظم انگلستان سے ملاقات کے لیے وقت مقرر کرنے کی درخواست کی تو جواب ملا کہ ہم بہت مسرت سے ملیں گے لیکن برار کے مسئلے پر کوئی بات چیت نہ کی جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ انگریزی حکومت کی اس سرد مہری اور بے رخی سے نواب مختارالملک کے دل کو سخت صدمہ پہنچا، اور وہ اپنے مقصد میں اس ناکامی کو کبھی نہیں بھولے۔ یہ قافلہ بہ حسن و خوبی ۲۴ اگست کو واپس بمبئی اور اگلے دن ۲۵ اگست کو حیدرآباد پہنچا۔

فروری ۱۸۸۲ء میں ڈیوک آف مکلنبرگ حیدرآباد تشریف لائے۔ ولایت کے شاہی خاندان کے فرد تھے اور وہاں کے سفر کے زمانے سے نواب صاحب موصوف کے ان سے بہت دوستانہ تعلقات تھے۔ نواب مختارالملک کا ارادہ تھا کہ ۸ فروری کو بڑے وسیع پیمانے پر ان کے اعزاز میں پر تکلف دعوت دیں۔ سوء اتفاق سے اس سے دو ایک دن پہلے نواب افضل الدولہ مغفرت مکان کی صاحبزادی کا انتقال ہو گیا۔ یہ نواب شمس الامرا مرحوم کی بیگم تھیں۔ اس پر وہ دھوم دھامی دعوت منسوخ کرنا پڑی اور فیصلہ ہوا کہ اس کی جگہ صرف ساٹھ آدمیوں کی ایک مختصر سی دعوت دی جائے۔ لیکن کارکنان قضا و قدر کو یہ بھی منظور نہ تھا۔ سات کی شام کو حسب معمول بہت رات گئے تک اپنے فرائض منصبی کی دیکھ بھال میں مشغول رہے۔ دو بجے شب کو یکایک طبیعت خراب ہو گئی۔ اطبا نے تشخیص کی کہ ہیضہ کا حملہ ہوا ہے۔ لیکن کسی نے معاملے کی سنگینی کا احساس نہیں کیا اور سب اپنے اپنے کام کاج میں مشغول رہے۔ یہاں تک کہ دونوں صاحبزادے بھی صبح کے وقت باریاب ہو کر پروگرام کے مطابق مہمان معظم کے ساتھ شکار پر روانہ ہو گئے۔ پہلے اپنے ذاتی معالج کا علاج رہا، اس کے بعد حیدرآباد کے مشہور

طبیب میرزا علی سے رجوع کیا گیا، لیکن مرض میں کوئی تخفیف نہیں ہوئی اور ان کی حالت رفتہ رفتہ بد سے بدتر ہوتی گئی۔ سہ پہر کو دو بجے کے لگ بھگ مسٹر جونس W B Johnes انگریز ریذیڈنٹ عیادت کے لیے آیا، اس نے واپس جاکر ریذیڈنسی کے ڈاکٹر بومان Beaumont کو دیکھنے کے لیے بھیجا۔ لیکن وقت آلگا تھا قے اور اسہال کی کثرت سے سخت نڈھال ہو گئے تھے۔ دعا اور دوا سب بیکار ثابت ہوئیں۔ القصہ پورے تیس برس تک اپنے ملک اور مالک کی نیک نیتی اور دیانت داری، دانائی اور بیدار مغزی کے ساتھ خدمت کرنے کے بعد ۸ مئی جمعرات کی شام کے ساڑھے سات بجے جاں بحق ہوتے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ تاریخ وفات کا مصرع ہے۔

گم بہ شد معدن فطرت ز دکن

ایک دوسری تاریخ "جنازہ وزیر اعظم" میں بہت حضرات کو توارد ہوا۔

جنازہ جمعہ کے دن ۹ مئی کو اٹھا۔ حیدرآباد کے مشرقی حصے میں تالاب میر جملہ کے قریب دائرہ میر مومن میں محوِ خواب ابدی ہیں جہاں اس زمانے میں یہاں کے شیعہ حضرات دفن ہوا کرتے تھے۔ خاندان مختارالملک کے مدافن اس دائرے میں ایک الگ چہار دیواری میں ہیں۔ مختارالملک کی قبر اندر چبوترے کی سیدھی جانب واقع ہے۔

نواب مختارالملک کا نکاح ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۴ء) میں نواب میر غلام حسین خاں فخرالملک بہادر کی صاحب زادی حیات النساء بیگم سے ہوا تھا۔ شادی کے بعد شوہر نامدار کے گھر میں ان کا عزیزالنساء بیگم نام اور دولہن بادشاہ خطاب قرار پایا۔ نواب صاحب کی وفات کے وقت ان کی مندرجہ ذیل اولاد موجود تھی۔

دو بیٹیاں — نورالنساء بیگم عرف بڑی صاحبزادی — اور سلطان بخت افروز بیگم عرف چھوٹی صاحبزادی۔

دو بیٹے تھے میر لائق علی خاں ولادت ۱۲ نومبر ۱۸۶۱ء خطابات سرسالار جنگ مختارالملک عمادالسلطنت کے سی۔ ایس۔ آئی۔ صرف ۲۳ برس کی عمر میں جنوری ۱۸۸۴ء میں مدارالمہام دکن ہوتے۔ عین شباب کے عالم میں ۶ جولائی ۱۸۸۹ء کو انتقال کیا۔ میر یوسف علی

خاں سالار جنگ انہیں کے اکلوتے بیٹے تھے۔ یہ اپنے والد کی وفات کے وقت صرف ۲۵ دن کے تھے۔ بڑے صاحب ذوق اور ماہر فنون لطیفہ تھے۔ حیدر آباد کے سالار جنگ میوزیم کا جملہ سامان اور کتاب خانہ بیشتر انہی کا جمع کیا ہوا تھا۔ یہ ۱۹۴۶ء میں لاولد فوت ہوئے۔

دوسرے بیٹے نواب مختار الملک کے میر سعادت علی خاں تھے۔ ان کی ولادت اپریل ۱۸۶۲ء میں ہوئی۔ غیور جنگ شجاع الدولہ منیر الملک ثالث بہادر ان کے خطاب تھے۔ انہوں نے بھی ۲۷ برس کی عمر میں ۲۷ دسمبر ۱۸۸۹ء کو لاولد انتقال کیا۔

از خاندان کسریٰ دیگر کسے نماند

غالب نے اگست ۱۸۶۰ء (صفر ۱۲۷۸ھ) میں اپنے دیوان اردو کا ایک نسخہ معلوم نہیں کس کی تحریک پر نواب مختار الملک کی خدمت میں نذر بھیجا۔ ان کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا۔ لیکن منشی محمد حبیب اللہ ذکا نے جو ان کے میر منشی تھے، انہیں ایک خط لکھا۔ جس میں میرزا سے ان کے دیوان فارسی اور ماہ نیم ماہ کی فرمائش کی تھی۔ غالب نے خیال کیا کہ یہ فرمائش نواب مختار الملک بہادر کے ایما سے ہوئی ہے۔ اور جواب میں لکھا (۱)، کہ ماہ نیم ماہ وجود میں آیا ہی نہیں اور کلیات فارسی کا پہلا ایڈیشن کہیں سے دستیاب نہیں ہو سکتا۔ جو نسخے تھے وہ ۱۸۵۷ء کی رستخیز میں ضائع ہو گئے۔ اس کی دوبارہ اشاعت کی کوشش ہو رہی ہے۔ اگر ڈول بن گیا تو مطبوعہ نسخہ حاضر خدمت ہوگا اور اگر اس کا انتظام نہ ہو سکا تو کاتب سے لکھوا کر قلمی نسخہ بھجوا دوں گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی کے بعد انہوں نے وہ قصیدہ نواب مختار الملک بہادر کی مدح میں لکھا اور ان کے منشی انشا مولوی موید الدین خاں کی وساطت سے ان کی خدمت میں گزرانا، جس کا مطلع ہے۔

درمدح سخن چساں نگویم
شرطست کہ داستاں نگویم

۱۔ کلیات نثر فارسی (غالب) (ص۔ ۲۴۶-۲۴۷)

یہ کلیات مطبوعہ میں نمبر ۶۳ پر چھپا ہے۔ غالب بالعموم قصائد خاص اہتمام سے خوشنویس سے افشانی کاغذ پر لکھوا کے ممدوح کی خدمت میں پیش کیا کرتے تھے۔ لیکن یہ قصیدہ انہوں نے اپنے قلم سے لکھ کے حیدر آباد بھیجا تھا۔ ان کی اصلی تحریر آج بھی سالار جنگ میوزیم میں دیکھی جا سکتی ہے۔

معلوم ہوتا ہے صلۂ ستایش تو درکنار، ممدوح کی طرف سے اس کی رسید تک موصول نہ ہوئی۔ اس پر انہوں نے ایک عرضداشت لکھی جو ان کے کلیات نثر فارسی میں شامل ہے۔ (صفحہ ۲۴۷-۲۴۸) اس پر بھی صدائے برنخاست۔ اس کے بعد انہوں نے نو خط یکے بعد دیگرے نواب صاحب ممدوح کے نام لکھے۔ لیکن جب کسی کا جواب نہ ملا تو انہوں نے مولوی موید الدین سے استمداد کی (جن سے ان کے پہلے کے مراسم تھے) اور پہلی عرضداشت کی نقل بھی ملفوف کر دی۔ مولوی صاحب نے نواب مختار الملک کو اپنے نام کا یہ خط دکھایا اور عرضداشت بھی پیش کی — اس پر حکم ہوا کہ دارالانشا میں تفتیش اور تلاش کی جائے تاکہ میرزا صاحب کو جواب لکھا جا سکے۔ اس دوران میں کلیات نظم فارسی کا دوسرا ایڈیشن بھی چھپ چکا تھا۔ میرزا نے حسب سابق اس کا ایک نسخہ بھی مولوی موید الدین خاں کی معرفت نواب صاحب کی خدمت میں بھیج دیا، اور لکھا کہ اگر پہلا قلمی قصیدہ دارالانشا میں دستیاب نہ ہو سکے۔ تب بھی یہ کلیات مطبوعہ میں ممدوح کی نظر سے گزر سکتا ہے۔ (نگار لکھنؤ اپریل ۱۹۵۹ء ص ۹-۱۰) یہ معلوم نہ ہو سکا کہ انہیں قصیدے پر کچھ انعام ملا یا نہیں۔

کتابیات

۱۔ مرقع عبرت — از نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی
(ترجمہ — مولوی مہدی حسن)، اعظم اسٹیم پریس حیدر آباد (۱۳۰۰ھ)

۲۔ ریاض مختاریہ سلطنت آصفیہ — از میر دلاور علی دانش
مطبع ہزار داستان۔ حیدر آباد (۱۹۴۲ء)

۳۔ سر سالار جنگ اعظم — از ابوالمکارم فیض محمد
افتخار پریس۔ حیدر آباد (۱۹۵۰ء)

۴- تاریخ حیدرآباد دکن ۔ از مولوی محمد نجم الغنی
نول کشور پریس ۔ لکھنؤ (۱۹۳۵ء)
۵- کلیات نثر غالب (فارسی) ۔ از غالب
مطبع نولکشور ۔ لکھنؤ ۔ (۱۸۸۴ء)
۶- کلیات نظم غالب (فارسی) ۔ از غالب
مطبع نولکشور ۔ لکھنؤ ۔ (۱۹۲۴ء)
۷- اردوی معلیٰ ۔ از غالب
کریمی پریس ۔ لاہور ۔ (۱۹۲۲ء)
۸- نگار (ماہ نامہ) ۔ لکھنؤ ۔ اپریل ۱۹۵۹ء
۹- دستاویز ۔ (POL. A Sept. 1880, Nos. 95/158)
(موجودہ قومی دفتر خانہ ہند ۔ نئی دہلی)
۱۰- دستاویز ۔ (POL. A April 1883, Nos. 95/100)
(موجودہ قومی دفتر خانہ ہند ۔ نئی دہلی)

■■

غالبؔ اور ذال فارسی

۱۔ غالب پر کلکتہ میں جو اعتراض ہوتے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ وہ گذاشتن، گذشتن اور پذیرفتن کو "ز" سے لکھتے ہیں۔ اس اعتراض سے واقف ہونے کے بعد غالب نے جو خط مرزا احمد بیگ خاں، طپاں کو بھیجا تھا اس میں انھوں نے اقرار کیا ہے کہ ان لفظوں کو "ز" سے لکھتا ہوں، مگر وہ اسے غلطی املا تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں:

دیگر ہم درآں صحیفہ مندرج بود کہ گزاشتن، گزشتن و پزیرفتن بزائے ہوز نوشتن غلطی املا (۱) است، نکتہ شناسا، غلطی املا وقتے مے تواں گفت کہ کاتب (۲) دانا بداں نبا شد و سہو در تحریر افتد، حال آں کہ تحقیق ما برتے ما کافی و در نفس خویش تمام است" مآثر غالب صفحہ ۲۴۔

اس خط میں صرف تین لفظوں سے بحث ہے، اور غالب نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ فارسی میں کسی لفظ کو "ذ" سے نہ لکھنا چاہیے۔ لیکن اس سے کم و بیش بیس برس

۱۔ اس مقالے میں علامات و مخففات ذیل مستعمل ہوتے ہیں، ص صفحہ، و ورق، م کتب خانہ مشرقیہ، پٹنہ۔ ط۔ مطبوعہ۔

فارسی میں یائے زاید بہت ہے، لیکن غلط کی جگہ غلطی ایرانیوں کے یہاں اب تک نہیں ملا۔ بہار نے ابطال ضرورت میں اس کی سند "غلطی مکن نگارا" حافظ کے کلام سے دی ہے۔ مگر اس میں یائے معروف نہیں، یائے مجہول ہے، اور وہ زائد نہیں ہے۔ ۲۔ "کاتب" مآثر غالب میں نہیں، مگر موید برہان میں ہے (غالب کے خط کا ایک ٹکڑا اس میں نقل ہوا ہے)، مآثر میں غالباً طباعت کی غلطی ہے۔

بعد قاطع برہان میں ذال سے متعلق یہ الفاظ ان کے قلم سے نکلے:

"جگر تشنگان تحقیق را از رشح خانہ من سیرابی معنی یابی روزی باد کہ در فارسی دو حرف متحد المخرج، بلکہ قریب المخرج نیز نیامدہ۔ سین سعفص، و ثلیے ثخذ و صاد مہملہ نیست، تائے قرشت ہست و طائے دستہ دار نیست۔ الف است و عین نیست، بلکہ غین ہست و قاف نیست۔ ہر آئینہ چون زائے ہوز ہست و ضاد ضدیت و ظائے، تناظر نیست ذال ذلت چرا باشد و بودن، دو حرف متحد المخرج چوں روا باشد؟ آرے دبیران پارس را قاعدہ چناں بود کہ بر سر دال ابجد نقطہ نہادندے (۱)، پسینیاں ازیں رسم الخط بوجود ذال منقوطہ درگماں افتادند۔ چوں دریں اندیشہ وجود دال بے نقطہ از میاں مے رفت، وہمہ ذال منقوطہ مے ماند، اکابر عرب قاعدہ قرار دادند و تفرقہ دال و ذال را برآن قاعدہ اساس نہادند، و ایں کہ من میگویم نہ گفتار من است، بل کہ فرمان آموزگار من است و آں شت ہرمزد نام پارسی نژاد فرزانہ بود۔" درفش کاویانی ص ۱۳

اس عبارت کا خلاصہ یہ ہے، (۱) ذال سے متعلق غالب کا بیان ہرمزد کے قول پر مبنی ہے۔ (۲)، فارسی میں دو حرف متحد المخرج یا قریب المخرج موجود نہیں۔ (۳)، فارسی میں جب "ز" ہے تو جس طرح متحد المخرج حروف "ض" اور "ظ" نہیں ہیں "ذ" بھی نہیں ہے۔ (۴)، زمانہ قدیم میں کاتب "د" "ذ" میں فرق نہیں کرتے تھے۔ اور "د" پر بھی نقطہ دیا کرتے تھے، جس کی وجہ سے "ذ" کا وجود خطرے میں تھا، (۵) اکابر عرب نے یہ دیکھ کر ایک قاعدہ بنایا کہ دونوں حرفوں میں تمیز ہو سکے۔

اس سلسلے میں امور ذیل توجہ طلب ہیں۔

(۱) ہرمزد کے وجود خارجی

۱۔ یہ بات احمد نے فرہنگ جہانگیری کا حوالہ دے کر اس سے نقل کی تھی، لیکن غالب نے تیغ تیز میں ان پر سرقے کی تہمت لگائی ہے اور لکھا ہے کہ یہ بات بالکل نئی ہے میں نے ہرمزد سے سنی تھی کسی قدیم "فرہنگہائے پیشیں" میں نہیں مل سکتی۔

ـــــــ سالہ کا کوئی ثبوت موجود نہیں اور یہ مان بھی لیا جائے کہ اس نام کا ایک ایرانی غالب کا استاد رہا تھا، اور غالب کا بیان اس کے قول پر مبنی ہے، تو فارسی میں "ذ" کے ہونے یا نہ ہونے کی بحث میں اسے کچھ اہمیت حاصل نہیں، اس لیے کہ ہرمزد ایک مجہول الحال شخص ہے، جس کی نہ کوئی تحریر موجود ہے اور نہ جس سے غالب کے علاوہ کوئی شخص واقفیت کا مدعی ہے۔

۲۔ فارسی میں قریب المخرج حروف کا ہونا بدیہیات سے ہے "ب" "پ" "ف" قریب المخرج ہیں۔ "ل" "ر" ایک دوسرے کے قریب سے نکلتے ہیں اور یہی حال "ک" "خ" کا ہے۔ خود غالب نے بھی قاطع میں ایک دوسری جگہ اس کا اعتراف کیا ہے کہ "ت" "د" "ر" قریب المخرج ہیں۔

"راستاد غلط است صحیح رستاد است کہ مرکب از رستی وداد است۔
چوں در دو حرف قریب المخرج برافگندن احد المتجانسین رسم ست استاد ماند"
درفش ـــ ص - ۴۷

۳۔ "ض" "ظ" "ذ" اور "ز" متحد المخرج نہیں، ایران کے مروجہ تلفظ کی بنا پر یہ حروف متحد المخرج قرار دیے گئے ہیں۔ جب بھی ض کا معاملہ مشکوک ہے۔ سعدی کے ایک شعر میں "عدل" و "فضل" ۲ کا قافیہ آیا ہے۔

۴۔ غالب کو یہ بتانا تھا کہ کن قدیم کتابوں میں "د" و "ذ" بالالتزام یکساں لکھے گئے ہیں۔ یہ بات فرہنگ جہانگیری میں بھی ہے، مگر اس کا جامع بھی غالب کی طرح ان نسخوں کا ذکر نہیں کرتا جن سے یہ دعویٰ ثابت ہو سکتا ہو۔

۵۔ اس دعوے کا کہ اکابر عرب نے "د" و "ذ" میں تفرقے کے لیے ایک قاعدہ بتایا، کوئی ثبوت موجود نہیں اور یہ بات لگتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی۔

۶۔ غالب نے یہ کہہ کے کہ "د" و "ذ" میں تفرقے کے لیے قاعدہ بنایا تھا، خود یہ تسلیم کر لیا ہے کہ فارسی میں "ذ" تھی، یہ دوسری بات ہے کہ انہیں اس کا احساس نہ ہو۔

۱ـــ میں اس کا قائل نہیں کہ ہرمزد ثم عبد الصمد وجود خارجی رکھتا تھا۔ اس موضوع پر میرا مقالہ علی گڑھ میگزین کے غالب میں شائع ہو چکا ہے۔

۲ ـــ بوستان طبع بمبئی ص ۱۱، مگر جام جم اودھی طبع ایران میں ص ۶۶ میں فیض قافیہ غیظ۔

غالب نے قاطع میں آذر (آتش)، ص ۱۳ اور تذرو کو "د" سے اور آذر (نام ماہ وروز) ص ۱۳، پذیرفتن، پذرفتن ص ۴۹، گذاشتن وگذاردن اسپندانذ اور اسپندارذ ص ۱۰۸ کو ز سے لکھنے کا حکم دیا ہے۔ (بعض نامانوس الفاظ کے بارے میں بھی غالب نے رائے ظاہر کی ہے، مگر میں ان سے بحث نہیں کرتا۔)

۲۔ آغا احمد علی، احمد نے موید برہان میں فارسی میں وجود یا عدم ذال سے متعلق مختلف فرہنگ نگاروں کے اقوال نقل کیے تھے اور صراحت کے ساتھ یہ دکھایا تھا کہ فارسی میں قریب المخرج حروف نہ ہونے کے بارے میں غالب کا دعویٰ کس قدر غلط ہے، غالب نے تیغ تیز میں جو اس کا جواب دیا ہے درج ذیل ہے:

"میں نے اتحاد مخرج موافق تلفظ کہا ہے نہ موافق قرائت کہ وہ خاص کلام مجید کی تلاوت کے واسطے موزوں ہے۔ گنبد کو بذال نقطہ دار ہم نے لڑکوں اور فرومایہ[1] لوگوں کے سوا کسی سے سنا بھی نہیں جو اس کی املا میں دخل دیں۔ ہاں، کاغذ در اصل دال ابجد سے ہے مگر خاص و عام کے تلفظ میں اور ہر کتاب میں عموماً ذال ثخذ سے ہے۔ اس کتابت اور تلفظ کی وہ تعمیم ہے کہ اگر کوئی خلاف اس کے لکھے یا بولے تو دیکھنے اور سننے والے اس کو مسخرہ بنائیں اس تلفظ اور اس املا کے احاطے سے نکلا نہیں جاتا۔ میں دال سے لکھوں گا۔ اور اس پر نقطہ دوں گا اور تلفظ میں دال نقطہ دار لاؤں گا۔ خلاصہ میری تحقیق کا یہ ہے کہ پذیرفتن، گذاشتن، گزشتن، گذاردن اور ان کے مجموع مشتقات اور اسمائے مشہور و ایام مثل آذر و اسفندارمز وغیرہ سب

---

(۱)۔ گنبد، تذرو وغیرہ کی طرح نہیں کہ اب بھی ذال سے لکھا جاتا ہو۔ لیکن ہندوستان میں بہت سے لوگ جن میں اچھے فارسی داں بھی شامل تھے، ذال سے لکھتے تھے، چنانچہ بکثرت کتابوں میں اسی طرح ہے۔ اس کا ایک ثبوت گنبد کی تصغیر گمزی کا وجود ہے۔ (ایسی کتابوں کے نام جن میں گنبد ذال کے ساتھ ہے، میں کسی دوسرے موقع پر پیش کروں گا۔)

زائے ہوز سے ہیں اور تدور اور کاغذ اور گنبد یہ تین لغت بھی بدال ابجد ہیں. اور یہ فارسی قدیم کے موافق ہے. گنبد کی دال پر نقطہ دینے والے لغو اور پوچ اور بے خبر ہیں. کاغذ کا نقطہ دینا اور پڑھنا ناچار قبول کرنا پڑا اور مرگ انبوہ کو جشن سمجھنا پڑا"۔ ص۔ ۲۲

توجہ طلب اُمور (۱) عرب ث، ص، ت، ط وغیرہ کے تلفظ میں فرق کرتے ہیں، یہ قرآن کے لیے مخصوص نہیں۔ ایرانی بھی اگر ض اور ز کے تلفظ میں فرق کرتے تو عجب نہیں۔ (۲) احمد نے فارسی میں قریب المخرج حروف کے وجود کے بارے میں تفصیل کے ساتھ لکھا تھا، غالب نے اس کا کچھ جواب نہیں دیا۔ (۳) غالب اس دعویٰ کے باوجود کہ ذ فارسی میں مطلقاً نہیں کاغذ کے مروجہ تلفظ و املا سے تعرض نہیں کرنا چاہتے۔ خوف یہ ہے کہ لوگ کہیں مسخرہ نہ بنائیں، یہ جرائت کی کمی ہے، غالب اگر تلاش کرتے تو بعض مستند ایرانی شعرا کے یہاں کاغذ ایسے الفاظ کا قافیہ مل جاتا جو "د" پر ختم ہوتے ہیں، اور کاغذ قافیہ خود آیا ہے۔ اسرار نامہ عطار م ۷، ۴ ص ۱۸۵ میں رومی کی مثنوی میں ہے:۔

گر نویسم شرح این بے حد شود
مثنوی ہفتاد تا کاغذ شود

(۴) فارسی میں وجود "ذ" کے جو شواہد موید برہان میں تھے، غالب نے ان کی طرف مطلق توجہ نہیں کی۔ اور انہیں کالعدم قرار دے کر وہی بات جو قاطع میں کہی تھی، دہرادی ہے۔ ان کے پاس جیسا کہ میں اوپر لکھ آیا ہوں عبدالصمد کے قول کے سوا اپنے دعوے کا کچھ ثبوت نہیں، اور یہ بات کہ کس لفظ کو "د" سے اور کسے "ز" سے لکھنا چاہیے لازماً اس کے حوالے سے نہیں لکھی گئی۔ غالب نے اس کی کوئی وجہ نہیں بتائی کہ کچھ الفاظ "د" سے اور کچھ "ز" سے کیوں لکھے جائیں۔

۲۔ ذیل میں کچھ وہ باتیں جو فارسی میں وجود ذال کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں، درج کی جاتی ہیں۔ ان میں سے بعض غالب کے علم میں بھی تھیں۔

(۱) یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ ایران کی قدیم زبانوں میں ایک حرف موجود تھا جس کا تلفظ وہی تھا جو عربی ذال کا ہے۔ لیکن مجھے اب تک یہ پتہ نہیں

سکا کہ یہ بات پایہ ثبوت کو کس طرح پہنچی۔ ادستانی زبان میں ذال کا قائم مقام ہ سمجھا جاتا ہے مگر یہ صرف وسط کلمہ میں آتا ہے۔ اس کے متعلق زیادہ تفصیل کے ساتھ میں کسی اور موقع پر لکھوں گا۔

۲۔ شہید بلخی کے یہاں تائید کا قافیہ پاییدملتا ہے، (لباب الالباب جلد ۲ صفحہ ۲) لیکن ابو طاہر خسروانی کے یہاں رسیند کا قافیہ تعویذ آیا ہے۔ (لباب ۲ صفحہ ۲۰) یہ دونوں شعرا عہد سامانی میں تھے "شعرائے آل سبکتگین" میں کسائی مروزی (لباب ۲ صفحہ ۳۵) چکیذ و شنبلیذ کا قافیہ عربی لفظ نبیذ لاتا ہے اور شاہ نامہ فردوسی میں نبیذ، چکیذ کی قبیل کے الفاظ کا قافیہ تو ملتا ہے لیکن اس کے پچاس ساٹھ ہزار اشعار میں تائید کی قسم کا لفظ جو دال پر ختم ہوتا ہے ایک جگہ بھی چکیذ و رسیذ وغیرہ کا قافیہ نہیں آیا۔

بیارید کس گفت، جام نبیذ

بیاد تہمتن بلب درکشیذ

۔شاہ نامہ، لکھنؤ جلد ا صفحہ ۱۳۲

۳۔ کتاب الابنیہ عن حقائق الادویہ مصنفہ موفق ہروی کا ایک نسخہ جسے اسدی طوسی شاعر مشہور نے ۴۴۷ھ میں لکھا تھا[1] ــ یورپ میں موجود ہے اور مطبوعہ نسخہ اسی پر مبنی ہے۔ اس مخطوطے کے ایک صفحے کا عکس بیست مقالہ قزوینی جزو اول میں موجود ہے، جس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی ذال و دال کے معاملے میں اس قاعدے پر عمل ہے جسے ظہیر وغیرہ نے نظم کیا ہے، چنانچہ اس میں باذ، ایزذ، بوذ، داذ، اور دروذ کی دالوں پر باستثنائے دال اول داذ و دروذ نقطہ دیا ہوا ہے۔ اور دال اول داذ و دروذ اور دال گسترد ند پہ نقطہ نہیں ہے۔

۴۔ اسدی طوسی کی فرہنگ فارسی ایک بار یورپ میں اور دو بار ایران میں طبع ہو چکی ہے۔ اس میں الفاظ بترتیب حروف تہجی جمع کیے گئے ہیں، لیکن پہلے حرف نہیں آخری حرف (یا بعض صورتوں میں حرف ماقبل آخر) کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ اس میں دال و ذال کے باب الگ الگ ہیں۔ ناورد، نبرده، آسعده، فرزد،

ا۔ یہ فارسی کے قدیم ترین مخطوطوں میں ہے جو محفوظ رہ سکے ہیں۔

اروند، ترقند وغیرہ دال کے باب میں اور مانیذ، موبذ، پدیذ، بنلاذ راذ وغیرہ ذال کے باب میں ہیں۔

۵۔ ابوعبداللہ حسین نطنزی کی دستور اللغتہ م میں (جو پانچویں صدی ہجری کے اواخر کی تالیف ہے) یہ عبارت ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ نطنزی ث ص وغیرہ کے برخلاف ذ کو ایک فارسی حرف سمجھتا ہے۔ اولحروف لاتدخل الفارسیہ ثمانیتہ یجمعہا صح حط ثظ قض"۔ صفحہ ۱۵۲

۶۔ فرہنگ جہانگیری کے دیباچے میں سنائی کے اشعار نقل کیے ہوتے ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے۔ اس شعر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حروف کی تعداد ۲۴ ہے۔ اور یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے کہ پ، چ، ژ، گ اور ذ شمار میں آئیں اور وہ غیر فارسی حروف جن کا ذکر نطنزی نے کیا ہے، محسوب نہ ہوں۔

تو اگر واقفی بصرف حروف
بدلش کن ببیست وچار حروف

۷۔ دستت بسخاوت[1] ید بیضا بنموذ
از جود تو بر جہاں جہانے افروذ
کس چوں تو سخی نہ ہست نہ خواہد بوذ
گو قافیہ دال زہے عالم جوذ

یہ (۱) رباعی انوری کی ہے اور اس میں انوری نے قوافی میں اختلاط دال و ذال کی معذرت کی ہے۔ اسی طرح ایک قطعے میں جس کے قوافی باذی شاذی وغیرہ ہیں بعض عربی قوافی لانے کا عذر کیا ہے۔ جو دال سے ہیں۔

۱۔ کلیات انوری کے کسی نسخے میں یہ رباعی ہے اور کسی میں نہیں ہے۔ اور جن نسخوں میں ہے ان میں اختلاف بھی ہے۔ میں نے رباعی کی وہ شکل اختیار کی ہے جو شرح قطعات انوری مصنفہ ابوالحسن فراہانی نسخہ "م" میں ہے۔ ۔۔۔ ۱۵۰۔و

چو گر درا) دعا قت قافیہ دال گردد
چو لفظ مبادی مثل یا منادی
بیک قافیہ سند (۲) عیبے نیاید
بگوییم کہ تابدرہ من شیذ بازی

۸ــ حلل مطرز نسخہ م میں ہے ور (ایک آدھ لفظ جھد کے بعد ضائع) ماورأ النہر ذال معجم اصلا نیست، چنانچہ مولانا شمس الدین طبسی رحمۃ اللہ تعالیٰ در کتاب عروض فارسی ذکر کردہ، و ۷۔ شمس الدین طبسی ایک مشہور شاعر ہیں جن کا ذکر لباب اور تاریخ گزیدہ دونوں میں ہے اور شاید یہی کتاب عروض کے مصنف ہیں۔ ایک گمنام شاعر بھی اس نام اور نسبت کا ہے جو صاحب تاریخ گزیدہ کا ہم عمر تھا۔ صفحہ ۸۱۸

اعرف الفرق بین دال و ذال
وہی اصل بالفارسیۃ معظم
کل ما قبلہ سکون بلا دای
فدال و ماسواہ معجم

یہ دو شعر تاریخ گزیدہ میں ظہیر فاریابی (ص ۸۱۸)، حلل مطرز میں مصنف کے نام کے بغیر، فرہنگ شعوری (۳) جلد ا میں ظہیر فاریابی کے نام، اور حاشیہ قاموس (۴) جز اول میں فارابی کے نام درج ہیں۔ ظہیر فاریابی کے دیوان کے کل مطبوعہ نسخے (کلکتہ، ایران اور لکھنؤ) ان سے خالی ہیں، اور م کے قلمی نسخے میں بھی یہ شعر نہیں، مگر ظہیر عربی شعر کہتا تھا اور تاریخ گزیدہ کے زمانہ تصنیف کو دیکھتے ہوئے اس کی شہادت آسانی

۱۔ ان اشعار کا بھی وہی حال ہے جو رباعی کا ہے۔ شرح و ۱۵۰
۲۔ سند۔ حرام زادہ یعنی عیب دار۔ شید۔ خورشید
۳۔ ط قسطنطنیہ فارسی ترکی لغت
۴۔ ط مصر ۱۳۳۲ھ۔ فارابی کے ساتھ جب کوئی نام نہ ہو تو مشہور حکیم ابو نصر فارابی سے مراد ہوتی ہے، مگر اس کا احتمال ہے کہ حاشیے میں فارابی فاریابی کی جگہ غلطی سے چھپ گیا ہو۔

سے نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ ظہیر نے انوری کی طرح اختلاط قوافی دال و ذال کی معذرت بھی کی ہے:

گرچہ دریں شعر یک دو قافیہ ذالست
نے غرض از شعر قافیہ است مجرد[1]

۹۔ المعجم فی معاییر اشعار العجم (تصنیف ساتویں صدی کا نصف اول) میں ہے "بدانک در صحیح لغت دری ماقبل دال مہملہ الا رای ساکن چنانک دردو مردیا زای ساکن چنانک دزد و مزد یا نون ساکن چنانک کمند و گزند نباشد و ہر دال کہ ماقبل آن یکے از حروف مدو لین است چنانک باذ و شاذ و سوز و ستوذ و دیذ و کلیذ یا یکے او حروف متحرکست چنانک نمذ و سبذ دزو آمذ ہمہ ذال معجمہ اند، و در زبان اہل غزنین و بلخ و ماوراء النہر ذال معجمہ اند، و در زبان اہل غزنین و بلخ و ماوراء النہر ذال معجمہ نیست و جملہ دالات مہملہ در لفظ آرند"۔ صفحہ ۱۹۲۔

۱۰۔ آنانکہ بفارسی سخن میرانند   در معرض دال ذال رانشانند
ماقبل وے ار ساکن جز وائے بود[2]   دال است، وگرنہ ذال معجم خوانند

یہ رباعی فرہنگ جہانگیری کے دیباچے میں نصیر الدین طوسی کے نام لکھی ہے مگر یہ نہیں بتایا کہ کہاں سے ملی ہے۔ کلیات ابن یمین م ۱۳۷ صفحہ ۲۳۵ میں یہ رباعی موجود ہے، مگر میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ کلیات ط ایران میں ہے یا نہیں۔

۱۱۔ سعدی کے یہاں کوئی قافیہ جس میں تفرقۂ دال و ذال کے قاعدے کے خلاف ورزی ہو، نہیں ملتا، اور یہ محض اتفاق نہیں ہو سکتا، خصوصاً اس صورت میں کہ کلیات ط بمبئی کے صفحہ ۱۴۱ میں سود و شفتالود وغیرہ کا قافیہ ماخوذ اور صفحہ ۵۶ میں کشید و رید وغیرہ کا قافیہ لذیذ آیا ہے۔

۱۲۔ تاریخ گزیدہ آٹھویں صدی کے نصف اول کی کتاب ہے۔ اس میں ظہیر کے اشعار کا اظہار اختلاف کے بغیر موجود ہونا اس کا ثبوت ہے کہ خود اس کا

۱۔ ط لکھنؤ میں یہ شعر صریحاً غلط چھپا ہے۔ تصحیح مطابق مجمع الفصحا۔ جلد ۱
۲۔ مراد از حروف علت۔

مصنف وجود "ذ" کو مانتا ہے۔ اس کا مطبوعہ نسخہ ۸۷۵ھ کے ایک ایرانی نسخے کا عکس ہے۔ اس میں ذالات فارسی پر بالالتزام نقطے دیئے گئے ہیں۔

۱۳۔ قصیدہ بدائع الابحار مصنف سلمان ساوجی طبع آگرہ صفحہ ۲۱ میں شعر ذیل صفت رقطا کی مثال میں ہے۔ نقطہ دار کے بعد بے نقطہ اور بے نقطہ کے بعد نقطہ دار۔

ازاثر بوئے کش[1] طبع تو باز صبا ناقہ بستاں گشاذ

۱۴۔ مجمع الصنائع طبع ۱۲۶۱ھ میں لطف اللہ نیشاپوری کا یہ شعر صنعت جامع الحروف میں ہے:

اثر وصف غم عشق خطت ندہد خط کسے جز بضلا (صفحہ ۶۴)

۱۵۔ کلیات طبع ایران کے ایک قطعے میں (صفحہ ۱۹۶) ظہیر وغیرہ کا قاعدہ نظم ہوا ہے، اور میں نے اسے اپنے تبصرہ فرہنگ غالب (غالب نمبر علی گڑھ میگزین) میں نقل کیا ہے۔ ایسے دو قطعے اور ابن یمین کی طرف منسوب ہیں مگر مجھے یاد نہیں کہ کلیات طبع ایران میں ہیں یا نہیں۔ "ہر گاہ دال و ذال کہ در مفردے فتد زالفاظ پارسی بشنوز آنکہ مبہم است الخ"۔ یہ فرہنگ جہانگیری میں ہے۔ دوسرا قطعہ جس کا مصرع اول یہ ہے: "درمیان فارسی فرقے میاں دال و ذال" حلل مطرز میں ابن یمین کے نام سے ہے لیکن فرہنگ رشیدی میں خود یزدی صاحب حلل کی طرف سہواً منسوب ہوا ہے۔

۱۶۔ معیار جمالی مصنف فخری اصفہانی معاصر کا وہ حصہ جس کا تعلق لغات سے ہے اور جس میں لغات کی ترتیب میں حرف آخر کا لحاظ رکھا گیا ہے، مدت ہوئی روس میں چھپا تھا۔ اس میں دال و ذال کا باب قاعدے کے مطابق الگ الگ ہے۔

۱۷۔ حلل مطرز مصنفہ شرف الدین یزدی نویں صدی کے نصف اول میں لکھی گئی تھی، اس کتاب کے حوالے سے جو کچھ لکھا گیا ہے اس کے بعد یہ الفاظ ہیں: "بعضے از شعرا داذ و دوذ (قلمی نسخے میں دوز) دیدہ و نظائر آں در قافیہ دال مہمل ایراد کردہ اندو شاہد کہ درہ (کرم خوردہ) ایں رسالہ بندرت مثل آں مساہلہ اتفاق افتد اما

---

[1] موید برہان میں کش کی جگہ خوشش ہے جو صریحاً غلط ہے۔

اگر تفرقہ شود اولیٰ باشد ۶۷۔ اس کے بعد قاعدہ نثر میں لکھا ہے اور ابن یمین کا ایک قطعہ نقل کیا ہے فرہنگ جہانگیری وغیرہ میں، یزدی کی طرف ایک قطعہ بھی منسوب کیا ہے جس کا مضمون وہی ہے جو دستور اللغۃ نطنزی میں ہے مگر یہ قطعہ حلل میں جہاں اس کے ہونے کی توقع تھی، موجود نہیں۔

۱۸۔ شرف نامہ نسخہ م میں شہاب الدین کرمانی کا قطعہ جس میں قاعدہ نظم ہوا ہے، نقل کیا ہے۔

۱۹۔ مجمع الفرس کا ایرانی مولف سروری بھی ذالات فارسی کا قائل ہے۔

۲۰۔ ابوالحسن فراہانی شارح قصائد و قطعات انوری شرح قطعات صفحہ ۱۵۰ میں دال وذال میں فرق کرنے کا قاعدہ اور ابن یمین کا ایک قطعہ دیا ہے۔

۲۱۔ ایران کے نامور محقق محمد بن عبدالوہاب قزوینی مقدمہ تاریخ جہانگشائے جوینی میں لکھتے ہیں:

''در بلاد فارسی زبان باستثناے بعضے نواحی تا قرن ششم وہفتم بل ہشتم ہجری مابین دال وذال فارسی تمیز میداده و فرق میگذاشتہ اند، ہم در تلفظ (ظاہراً) وہم در کتابت (قطعاً)۔ در اغلب نسخ فارسی کہ اکنوں بدست است وقبل از قرن ہشتم استنساخ شده است، ذالہائے فارسی عموماً بانقطہ مسطور است، ولے از حدود قرن ہشتم ہجری ببعد بجہات نامعلوم بتدریج ایں تمیز از میانہ برداشتہ شد و ذالہائے معجمہ متدرجاً بدالہائے مہملہ بدل شده واکنوں در ایران جمیع ذالہائے فارسی را دال مہملہ خوانند و نویسند باستثنائے قلیلے از کلمات چوں گذشتن وگذاشتن پذیرفتن و آذر و آذربایجان وغیرہا''

۲۲۔ قزوینی کا قول صحیح ہے مگر ان کے زمانے میں بھی [۱] ایران کے نامی

۱۔ میرا خیال ہے کہ مشہور ایرانی شاعر سپہر معاصر غالب نے بھی اپنی کتاب براہین العجم میں جو فن قافیہ میں ہے ذالات فارسی کے وجود کا اقرار کیا ہے لیکن مجھے یاد نہیں کہ اختلاط قوافی دال وذال کی نسبت کیا رائے ظاہر کی ہے۔

شاعروں میں دال وذال کے قدیم فرق کو ماننے والے اور قوافی میں اس کا لحاظ رکھنے والے موجود تھے۔ شوریدہ[1] شیرازی کہتے ہیں:

بدیں نظم و نثر ژرف ہر آنکس کہ دید گفت
کہ بخ بخ ازاں فصیح کہ دہ دہ ازیں وحید
مرا سجع دال وذال نباشد پسند لیک
رہی را چو فرض گشت نیارست ازاں رہید

۲۳- یہ وہی بات ہے جو انوری کی رباعی و قطعہ اور ظہیر کے قطعے میں ہے۔ صبوری کا شعر ہے:

زود پشت یا بجام جم از ارمغان وحید
گو دال باش قافیہ امروز اد حدیست

۲۴- خاتمۂ کلام یہ ہے کہ ایرانی "ذ" کو فارسی حروف میں شمار کرتے رہے ہیں۔ گزاردن ز سے اور گذاردن "ذ" سے دونوں صحیح ہیں مگر مختلف معانی میں اور یہی بات ہندوستانی فارسی داں لکھتے آئے ہیں۔ گنبد آج کل "د" سے لکھا جاتا ہے۔ باقی تمام الفاظ جن کا ذکر میں نے کیا ہے "ذ" سے ہیں اور ایران میں "ذ" سے ہی لکھے جاتے ہیں۔ اس کی تصدیق ایران کی جدید فرہنگوں اور وہاں کی چھپی ہوئی دوسری کتابوں سے ہو سکتی ہے۔ آذر (اسم ماہ وروز) اور آذر (آتش) کا اِملا ایک ہے اور اسپندارند و اسپندارند میں جیسا کہ آقائے پورداوٗد کی کتابوں سے جو زردشتی موضوعات پر ہیں معلوم ہو سکتا ہے، اردو میں غالب کی وجہ سے گذشتہ، پذیرا وغیرہ کا جو غلط املا رائج ہو گیا ہے وقت آگیا ہے کہ اس سے احتراز کیا جائے۔

■■

۱- شوریدہ و صبوری کے طہران کے مشہور ماہنامے ارمغان سے ماخوذ ہیں جس کے بانی وحید دستگردی تھے۔

غلام رسول مہر

غالب کی شاعری کے بعض خاص پہلو

مانہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما

میرزا غالب کی شاعری کے کئی پہلو ایسے ہیں جن پر اب تک مرتب و جامع انداز میں سیر حاصل بحث نہیں کی گئی۔ میرزا پر بہت کچھ لکھا گیا۔ بے شائبہ مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے ہاں کے کسی شاعر کا ذکر اس تواتر و اہتمام سے شاید ہی کیا گیا ہو جس کی مثال ہمیں ہندوستان کے اس "رند سخن پیشہ" کے تعلق میں ملتی ہے۔ کتابوں سے قطع نظر کیجیے۔ اگر وہ مقالات ہی جمع کر لیے جائیں جو مختلف جرائد و رسائل میں اب تک چھاپے گئے، تو یقین ہے کئی ضخیم جلدیں مرتب ہو جائیں۔ بعض رسائل نے تو سالہا سال سے التزام کر رکھا ہے کہ میرزا کی ہر برسی پر خاص نمبر مرتب کیا جائے۔ عجیب بات یہ ہے کہ نہ اس موضوع پر نئے مضامین و مقالات ملنے ہیں کوئی دقت پیش آئی ہے اور نہ میرے اندازے کے مطابق ارباب ذوق کو طلب و تشنگی میں کوئی کمی محسوس ہوتی ہے، تاہم میرے محدود علم کی حد تک بعض پہلو ابھی تک یقیناً تشنۂ فکر و ترتیب ہیں۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اس کا ذکر سرسری طور پر کر دوں۔ شاید اس طرح ارباب علم و نظر کی توجہ ان کی طرف منعطف ہو جائے اور یوں ہمارے لیے تحقیق و کاوش کا ایک نیا گراں قدر سرمایہ وجود میں آ جائے۔

ایک پہلو یہ ہے کہ میرزا نے شاعری میں کئی نئی چیزیں پیدا کیں جو ان سے پیشتر کہیں نظر بھی آتی ہیں تو نہ ان کی حیثیت ممتاز و نمایاں ہے اور نہ ان کی جزئیات میں ایسی جامعیت ملتی ہے جو میرزا کے ہاں پائی جاتی ہے۔ ایسی جدتیں فارسی میں بھی خاص ہیں لیکن اردو میں ان کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

اردو شاعری میں میرزا نے ایسا اسلوب اختیار کیا جس سے اس زبان کی ممکنات ارتقا کمال پر پہنچ گئے اور ہر نوع کے مطالب بے تکلف بیان کرنے کی ایسی صلاحیتیں آشکارا ہو گئیں جو میرزا سے پہلے یا تو بروئے کار نہیں آئی تھیں یا ان میں ویسی وسعت اور دقیق جزئیات کے اظہار کی ہمہ گیری نہ تھی۔ اس اعتبار سے میرزا قدیم و جدید کے درمیان ایک زریں سلسلے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میرے محدود علم کے مطابق ان کی شاعری کے اس پہلو پر اب تک زیادہ غور و فکر نہیں کیا گیا حالانکہ یہ ان کی عظمت و رفعت کا ایک اہم وثیقہ ہے۔

اس ضمن میں یہ عرض کر دینا بھی غالباً نامناسب نہ سمجھا جائے کہ نظم کے علاوہ میرزا نے اردو نثر میں بھی ایک بدیع انداز کی طرح ڈالی۔ ان کی وفات پر ایک صدی گزر چکی ہے۔ اس مدت میں عالی منزلت ادیبوں کی ایک طویل صف کے درخشاں کارنامے اردو زبان کا پرچم گراں مائیگی روح ثریا پر پہنچا چکے ہیں، لیکن میرزا کی اردو نثر آج بھی مختلف اعتبارات سے یگانہ و یکتا ہے۔ جس طرح گلستاں کی فارسی سات سو سال کے بعد بھی ویسی ہی تازہ و دلکش معلوم ہوتی ہے جیسی سعدی کے عہد میں ہو گی اس طرح میرزا غالب کی اردو نثر بھی کئی صدیاں گزر جانے کے بعد باوصف بدستور تازگی و دلکشی کا مرجع بنی رہے گی۔

بیس پچیس سال یا اس سے بھی پیشتر ہمارے ہاں ایک عجیب مشغلہ شروع ہو گیا تھا۔ یعنی مختلف اصحاب نے میرزا غالب کے بعض اردو اشعار سے بظاہر جزواً ملتے جلتے اشعار بعض فارسی اساتذہ کے کلام سے چن کر پیش کر دیتے اور دعوا کیا کہ مرزا پر تو سرقے کا الزام عائد ہوتا ہے۔ ایک صاحب نے تو (اللہ انہیں معاف کرے) اسے اپنا مستقل وظیفہ قرار دے لیا تھا۔ شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس کے کلام سے چند ایسے اشعار نہ چنے جا سکیں جنہیں مطالب و معانی کی ایک گونہ جزوی مشابہت کے اعتبار سے "سرقے" کے تحت نہ لایا جا سکے، یا متقدم اساتذہ کی بعض اچھی تراکیب سے متاخرین نے فائدہ نہ اٹھایا ہو، لیکن کوئی حق پسند اسے سرقہ قرار نہ دے گا۔ میرزا غالب کی زندگی میں بھی غالباً ایسا ہی کوئی واقعہ پیش آیا ہو گا جس پر انہوں نے مزاحاً کہہ دیا کہ۔

مبر گمان توارد، یقیں، شناس کہ دزد
متاع من کہ نہاں خانہ ازل برداشت

تاہم ظاہر ہے کہ حقائق علمیہ لطیفہ بازیوں کی بنا پر بے اصل نہیں بن سکتے۔ اسی طرح جو افسانے محض ظنون وادام کے تار و پود سے تیار ہوتے ہوں وہ اس وجہ سے حقیقت کا درجہ حاصل نہیں کر سکتے کہ چند افراد انہیں وقتاً فوقتاً دہراتے رہے۔ اہل علم و نظر کا وظیفہ یہی تھا کہ ایسے تمام اشعار بالمقابل رکھ کر جائزہ لیا جائے کہ الزام کی حقیقی حیثیت کیا ہے۔ آیا واقعی مرزا غالب نے کوئی پرانا مضمون کسی شاعر ماضی کے کلام سے اخذ کیا اور اسے اٹھا کر اپنے الفاظ میں باندھ دیا؟

ایک نہیں بیسیوں مضامین مل جائیں گے جو ابتدا میں کچھ تھے۔ مختلف اساتذہ نے ان میں اضافوں یا بندش میں گوناگوں ترتیبات کے بعد کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ یہ نہ سرقہ ہے نہ توارد، یہی سمجھا جائے گا کہ ایک نکتہ کسی شاعر کو سوجھا لیکن وہ اس کے تمام پہلوؤں کا حصر نہ کر سکا۔ دوسرے بالغ نظر شاعر نے اس نکتے کے اطراف و جوانب پر زیادہ گہری اور حقیقت شناس نظر ڈالی اور اسے بالکل نیا رنگ دے دیا۔ اس کی متعدد مثالیں میرے سامنے ہیں۔ لیکن پیش نظر گزارشات کا ہر حصہ مثالوں سے مزین کرنا چاہوں تو سلسلۂ بیان بہت طویل ہو جائے گا۔ جس حد تک مجھے علم ہے یہ کام بھی ہنوز انجام نہیں پا سکا۔

ایک پہلو یہ ہے کہ میرزا غالب کے فارسی کلام میں متعدد اشعار ایسے ہیں جو نفس مضمون کے اعتبار سے فارسی کے بعض مشہور اساتذہ کے اشعار سے مشترک معلوم ہوتے ہیں، لیکن ان کا اسلوب اور انداز بیان ایسا ہے جس سے بادی النظر میں اشتراک کا وہم بھی دل میں نہیں گزر سکتا۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ میرزا نے اصل مضمون کو زیادہ موثر، زیادہ دل نشیں اور زیادہ حقیقت افروز بنانے کی غرض سے نفس مضمون کا بنیادی اشتراک بے تکلف گوارا کر لیا۔ مثلاً عرفی کا ایک شعر ہے:

بہتر از شرم گناہ است نہ بخشیدن جرم
تو مرا عفو مکن جرم من از یاد ببرد

یعنی میرا گناہ بخشا گیا تو اس پر شرم دامن گیر ہوگی جو میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ اے رحیم و کریم تو مجھے معافی نہ دے۔ اپنی رحمت بے کراں سے ایسا کر کہ گویا تو نے میرا گناہ بالکل نظر انداز کر دیا ہے، بھلا دیا ہے۔

میرزا غالب کہتے ہیں:۔

هفت دوزخ در نهاد شرمساری مضمر است
انتقام است ایں کہ با مجرم مدارا کردہ

اے بخشندۂ عصیاں تو نے اپنی رحمت سے میرے گناہوں پر خطِ عفو کھینچ دیا، تیری شانِ کریمی کا تقاضا یہی تھا۔ اس سے مجھے جو ندامت و شرمندگی لاحق ہوئی اس کا دکھ، اس کا قلق اور اس کی اذیت میرے لیے سات دوزخ کے عذاب سے کم نہ تھی۔ اگر گناہوں کے لیے سزا دی جاتی تو ندامت و شرمندگی کی تعذیب سے زیادہ مصیبت خیز نہ ہوتی۔

دیکھیے عرفی اور غالب دونوں کا اصل مقصد یہ ہے کہ گناہ کے خلاف ہم جنسوں کے دل میں حد درجہ بے پناہ جذبہ پیدا کر دیں۔ ان کے شرفِ انسانیت کا احساس اس پیمانے پر بیدار کر دیں کہ وہ رضائے باری تعالیٰ کے خلاف ایک قدم بھی نہ اٹھائیں۔ نافرمانی سے دور بھاگیں۔ اس کی رحمت پر بھروسہ کرتے ہوئے حساب کے دن اس ندامت کا تختۂ مشق نہ بنیں، جس کا عذاب دوزخ کے انتہائی عذاب سے کم نہ ہوگا۔ کم از کم اس انسان کے لیے جو شرفِ انسانی کی غیرت سے بالکل محروم نہ ہو۔

غرض ایک اہم کام یہ بھی تھا کہ ایسے اشعار پر ٹھنڈے دل سے غور و فکر کے بعد اندازہ کیا جاتا کہ اصل مضمون ادا کرنے میں زیادہ کمال کس نے دکھایا۔ زیادہ تاثیر و نفوذ کس اندازِ بیان میں ہے۔ اس پر بھی اب تک زیادہ توجہ نہیں کی گئی۔

ایک پہلو یہ بھی تھا کہ میرزا غالب نے بعض ہم معنی یا تقریباً ہم معنی اشعار فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں کہے ہیں۔ ان پر غور کیا جاتا اور دیکھا جاتا کہ مضمون بہتر طریق پر کس زبان میں ادا ہوا اور معنویت کے اعتبار سے زیادہ تاثیر کس میں پیدا ہوئی۔ فارسی کے بعض اشعار ایسے بھی ہیں جن سے اردو کے ہم معنی یا تقریباً ہم معنی

اشعار سمجھنے میں سہولت پیدا ہوتی ہے۔

میں نے سرسری طور پر فارسی دیوان کی ورق گردانی کی تو چوبیس پچیس اشعار صرف غزلیات میں ایسے نکل آتے جن کے ہم معنی یا تقریباً ہم معنی اشعار اردو میں موجود ہیں۔ ان سب پر یہاں مفصل بحث تو ممکن نہیں لیکن مثالاً چند اشعار پیش کر دینا مناسب ہے۔ یہ کام بھی ضرور ہونا چاہیے۔

مرزا غالب کا مسلمہ اصول یہ ہے کہ شوق حالت وصل میں بھی تسکین نہیں پاتا اور اس کے اضطراب و بے تابی میں مطلقاً فرق نہیں آتا۔

فارسی میں کہتے ہیں:۔

بلبل بہ چمن بنگرد و پروانہ بہ محفل
شوق است کہ در وصل ہم آرام نہ دارد

بلبل کا محبوب پھول ہے تاہم دیکھیے کہ وہ پھولوں کے مرکز یعنی گلستان میں آہ و فغاں کرتی رہتی ہے۔ گویا محبوب کے جلووں کی فراوانی بھی اس کا عشق چھین نہیں لیتی۔ یہی کیفیت محفل میں پروانے کی ہے۔ اس کی محبوب شمع ہے جس کی روشنی میں محفل جمتی ہے پروانہ شمع کو دیکھتے ہی تڑپ تڑپ کر اس پر گرتا ہے اور جب تک جل کر خاکستر نہیں ہو جاتا اسے آرام نہیں آتا۔

یہ مثالیں اس حقیقت کا روشن ثبوت ہیں کہ:

شوق است کہ در وصل ہم آرام نہ دارد

یہ باغ اور محفل کا مشاہدہ تھا۔ اب اردو میں ایک اور مشاہدہ ملاحظہ فرمائیے:

گر ترے دل میں ہو خیال، وصل میں شوق کا زوال
موج محیط آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

موج سمندر سے ہم آغوشی کی حالت میں بھی برابر بے تاب و مضطرب ہوتی ہے اور مسلسل ہاتھ پاؤں مارتی جاتی ہے۔ یہ بھی اس حقیقت کی دستاویز ہے کہ سچا عشق حالت وصل میں بھی تسکین نہیں پاتا اور نہیں پا سکتا۔

وہ زوال سے کاملاً محفوظ و مصئون ہے۔

فارسی میں کہتے ہیں:

چرا بہ سنگ و گیا پیچی اے زبانۂ طور
زراہ دیدہ بہ دل در رو و زجاں برخیز

اے طور کے شعلے تو جمادات و نباتات سے کیوں لپٹتا ہے۔ پتھر اور شجر کو کیوں اپنی جمال آرائی کی تماشا گاہ بناتا ہے۔ تیرے لیے یہی زیبا ہے کہ ہماری آنکھوں کے راستے دل میں اتر جاتے، پھر جان سے بھڑک اٹھے۔

اردو میں کہتے ہیں:۔

گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

فارسی میں محض یہ کہہ کر معاملہ ختم کر دیا تھا کہ زبانہ طور کا اصل مقام ہمارا دل اور ہماری جان ہے لیکن اردو شعر میں اس کے لیے ایک دلیل بھی دے دی، یعنی یہ کہ شراب خوار کو شراب اس کے ظرف کے مطابق دیتے ہیں۔ طور پہاڑ یا نخل طور کا اتنا ظرف کہاں کہ برق کا متحمل ہو سکے۔ یہ ہمت و حوصلہ صرف انسان میں ہے۔

فارسی میں کہتے ہیں:

گریہ کرد از فریب و زارم کشت
نگہ از تیغ آب دار تر است

اردو میں فرماتے ہیں:

کرے ہے قتل عداوت میں تیرا رو دینا
تیری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے

فارسی: جنت نہ کند چارہ افسردگیٔ دل
تعمیر بہ اندازۂ ویرانی مانیست

اردو: دیتے ہیں جنت حیات دہر کے بدلے
نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے

غرض یہ میدان بھی خاصا وسیع ہے اور کچھ عجب نہیں قصیدوں ، قطعات ، رباعیات میں اور زیادہ مثالیں مل جائیں۔ مثلاً ایک قصیدے میں فرماتے ہیں :

نگہم نقب بہ گنجینۂ دلہا می زد
مژدہ باد اہل ریا را کہ زمیداں رفتم

یہ مضمون اردو میں یوں پیش کیا :

تھی نگہ میری نہاں خانۂ دل کی نقاب
بے خطر جیتے ہیں ارباب ریا میرے بعد

آخر میں گذارش ہے کہ ان پہلوؤں پر بھی ارباب ذوق کو توجہ اور غور و فکر کرنا چاہیے۔ اس طرح مطالعۂ غالب کے سلسلے میں نئے میدان ہمارے سامنے آجائیں گے اور ہمارے لیے دقائق شعر ذہن نشین کرنا سہل ہو جائے گا۔

"با فرد فرہنگ بیگانہ و با نام و ننگ دشمن با فرو مائیگاں ہم نشیں و با اوباش ہم رنگ پاتے. بیرا ہمہ پوتے و زبان بیصرفہ گو"[1]

لیکن آگرہ کی یہ مدت قیام جوش ہدو شعر اور شراب و شکر سے عبارت تھی، کتنے عرصے رہی اور وہ دہلی کب منتقل ہوتے اس کے لیے غالب کے بعض خطوں کی ورق گردانی کرنا ہوگی.

۱۔ مرزا غالب نواب علاؤالدین خاں کے نام خط میں جو ۱۶ فروری ۱۸۶۲ء کو لکھا گیا ہے، اپنا دہلی کا قیام اکیاون برس سے بتایا ہے.

"کل تمہارے خط میں دوبارہ یہ کلمہ مرقوم دیکھا کہ دلی بڑا شہر ہے. ہر قسم کے آدمی وہاں بہت ہوں گے. اے میری جان یہ وہ دلی نہیں ہے جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں. وہ دلی نہیں ہے جس میں اکیاون برس سے مقیم ہوں. ایک کیمپ[2] ہے."

اس خط کی رو سے غالب کے ورود دہلی کا سن ۱۸۱۱ء ہونا چاہیے.

۲۔ نواب کلب علی خاں کو یکم ستمبر ۱۸۶۶ء کے خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"برسات ایسی ہوئی ہے کہ میں باون، ترپن برس سے یہاں (دلی) رہتا ہوں. عرش آرام گاہ اکبر شاہ کے عہد میں ایک بار ایسی برسات دیکھی تھی یا امسال نظر آئی ہے."[3]

اس حساب سے غالب نے دہلی کا مستقل قیام ۱۴-۱۸۱۳ء میں اختیار کیا.

۳۔ مرزا غالب ۱۸۲۹ میں کلکتہ سے واپس آتے ہیں. اپنے سفر کی کیفیت اور مالی پریشانیوں کا حال بیان کرتے ہوئے میر اعظم علی مدرس مدرسہ اکبر آباد کو لکھتے ہیں:

"اکنوں ششمین سال است کہ خانماں بباد دادہ، و دل بہ مرگ ناگاہ نہادہ

۱۔ مہر نیمروز ۔ نسخہ قدسیہ ۱۸۵۴ ۔ ذاتی.

۲۔ خطوط غالب مرتبہ مولوی مہیش پرشاد ص ۲۳۵ - ۲۳۶ خط نمبر ۳/۶

۳۔ مکاتیب غالب طبع چہارم ۔ ص ۵۷

بہ کنجے نشستہ ام۔"

اس طرح یہ خط ۱۸۲۵ کا مکتوبہ ہونا چاہیے۔ اسی میں "درازی زمانِ فراق" کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"بہ گمان مخدوم شانزدہ سال است و بہ دانست نامہ نگارم از بست سال نیست"۔[1]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ غالب نے ۱۸۱۵ء کے قریب دہلی میں سکونت کی ہو گی۔

۴۔ لیکن اس سلسلے میں غالباً سب سے زیادہ اہم وہ خط ہے جو غالب نے منشی شیو نارائن آرام کے نام ۱۹ اکتوبر ۱۸۵۸ کو لکھا ہے۔

"برخوردار نور چشم منشی شیو نرائن کو معلوم ہو کہ میں کیا جانتا تھا کہ تم کون ہو۔ جب یہ جانا کہ تم ناظر بنسی دھر کے پوتے ہو تو معلوم ہوا کہ میرے فرزند ہو۔ میں اور وہ ہم عمر تھے۔ شاید منشی بنسی دھر مجھ سے ایک دو برس بڑے ہوں یا چھوٹے ہوں۔ انیس بیس برس کی عمر میری اور ایسی ہی عمر ان کی، باہم شطرنج اور اختلاط اور محبت۔ آدھی آدھی رات گزر جاتی تھی۔ ہمارے اور ان کے مکان میں صرف ایک رنڈی کا گھر اور ہمارے دو کٹڑے درمیان تھے۔ اس کٹڑے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا۔ اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے"۔[2]

اس خط کی شہادتیں زیادہ وزنی اور وقیع معلوم ہوتی ہیں۔ اس سے غالب کے اوقات ہی کا علم نہیں ہوتا بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ انیس بیس برس کی عمر تک آگرہ میں رہے، اور دہلی کا مستقل قیام ۱۸۱۶ء کے بعد پیش آیا۔ اسی خط میں راجہ بلوان سنگھ (خلف مہاراجہ چیت سنگھ والیٔ بنارس) کے ساتھ پتنگ اڑانے کا بھی ذکر ہے، جنھوں نے آگرہ میں مستقل اقامت ۱۸۱۲ء میں اختیار[3] کی تھی۔

۱۔ کلیات نثر فارسی ــ (غالب) طبع چہارم۔
۲۔ خطوط غالب ص ــ ۳۸۰ ــ ۳۸۱ اور خط نمبر ۱۲۱-۴۲
۳۔ غالب ــ غلام رسول مہر طبع سوم، ص ۷۹۔

غالب کی سیرت اور شخصیت کا اولین نقش آگرہ ہی میں صورت پذیر ہوا تھا،
اس لیے اکبر آباد کے قیام کی روداد اور اس زمانے کے کلام کا پتہ لگانا بہت ضروری
ہے۔ لیکن مستند معاصرانہ شہادتوں کی غیر موجودگی میں اس قیام کی تفصیل پیش کرنا
یا اس کی کوئی قطعی اور فیصلہ کن تاریخ مقرر کرنا دشواری سے خالی نہیں۔ لیکن غالب کے
نقل کردہ خطوط اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ وہ ۱۸۱۱ء تک ضرور آگرہ ہی میں تھے
اور اکثر و بیشتر شہادتیں اس خیال کو پایۂ یقین تک پہنچاتی ہیں کہ انہوں نے آگرہ کی
مستقل سکونت ۱۸۱۴ء کے بعد چھوڑ ہی ہوگی۔

بیرونی مآخذ میں نواب اعظم الدولہ سرور کا نادر اور گراں قدر تذکرہ ہمارے
لیے خاص طور پر اہم ہے۔ اس لیے کہ اس سے غالب کی ابتدائی زندگی اور ان کے قیامِ
آگرہ پر روشنی پڑتی ہے۔

تذکرہ سرور یا عمدہ منتخبہ کا ذکر ڈاکٹر اشپرنگر نے فہرست کتب خانہ شاہانِ
اودھ میں کیا ہے۔ لیکن اس کے بعض بیانات ناقص اور گمراہ کن ہیں۔ ترجمہ اسد میں
سرور کے حوالے سے لکھا ہے:

"اسد۔ اسد اللہ خاں معروف بہ مرزا نوشہ۔ ان کے بزرگ سمرقند کے تھے اور
یہ دہلی میں پیدا ہوتے تھے۔"[1]

ظاہر ہے کہ یہ بیان صحیح نہیں اور غالب دہلی میں نہیں، آگرے میں پیدا ہوتے تھے
اشپرنگر کو سرور کی عبارت پڑھنے اور سمجھنے میں سہو ہوا ہے۔ اس کے الفاظ جو انڈیا
آفس کے نسخے میں نقل کیے گئے ہیں:

"اسد تخلص۔ اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ اصلش از سمرقند مولد
مستقر الخلافہ اکبر آباد۔"[2]

شیخ محمد اکرام صاحب (آثار غالب) نے بھی سرور سے استفادہ کیا ہے۔ لیکن ان کے
یہاں بھی "غلطی ہائے مضامین" کچھ کم نہیں۔ اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سرور

۱۔ یادگار شعرا ص۔ ۲۲
۲۔ تذکرہ سرور (عمدہ منتخبہ) مخطوطہ انڈیا آفس۔

کے "ترجمہ اسد" کو پیش کر کے اس کی تنسیخ کی جائے۔

اس تذکرے کی شان نزول یہ ہے:

"عاصی میر محمد خاں المتخلص بہ سرور بسمع بلند فہمان نکتہ طراز و فصاحت منشان بلاغت پرداز می رساند کہ از ابتدائے سن شباب ذوق شعر گوئی ریختہ در دل متمکن بود، بعد چندے بقدر استعداد ذاتی آنچہ کہ از دل بزبان می آمد، موزوں می نماید بناعلی ہذا بخاطر فاتر خطور کردہ کہ اشعار ریختۂ شعرائے ماضی و حال جمع نمودہ بطور تذکرہ تالیف نماید و معنی قل و دل منظور دارد تا مطالعہ کنندگان را از طوالت رنج نیفزاید"۔[1]

سرور کے ذاتی حالات مجموعہ نغز میں زیادہ تفصیل سے دیتے ہیں:

"سرور بمعنی سردار تخلص اعظم الدولہ میر محمد خاں بہادر سلمہ اللہ اکبر خلف الصدق نواب غفران مآب اعظم الدولہ ابو القاسم بہادر مظفر جنگ است۔ جوانے است خوش طبع۔ خندہ پیشانی نیک اختلاط پاکیزہ زندگانی شیریں گفتار عذوبت بیان۔ نیکی کردار رافت نشان۔ استفادہ کتب متداولہ فارسی از مرزا جان بیگ سامی نمودہ و مشق سخن در ابتدا از میر فرزند علی موزوں فرمودہ، دیوانش دل چسپ و خاطر فریب است۔ تذکرۃ الشعرا بسیار خوب نوشتہ"۔[2]

اشپرنگر کا خیال ہے کہ قاسم کا مجموعہ نغز سرور کے تذکرے پر مبنی ہے لیکن یہ بیان نظر ثانی کا محتاج ہے۔ قاسم کے تذکرے میں ایسا مواد بھی ہے جو ان کی اپنی کوششوں سے جمع کیا گیا ہے اور جو تذکرہ سرور میں موجود نہیں ہے۔

قبل اس کے کہ تذکرہ سرور کا ترجمہ غالب پیش کیا جائے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس تذکرے کی تاریخ تصنیف کا اندازہ کر لیا جائے۔ ڈاکٹر اشپرنگر کا خیال ہے کہ عمدہ منتخبہ یا اعظم الدولہ نواب میر محمد خاں سرور کا یہ تذکرہ ۱۲۱۶ھ (۱۸۰۱ء) اور ۱۲۴۲ھ (۱۸۲۶ء) کے درمیان لکھا گیا ہے۔ یہ دونوں باتیں محل نظر ہیں۔ شیخ محمد

۱۔ تذکرہ سرور (عمدہ منتخبہ) مخطوطہ انڈیا آفس

۲۔ مجموعہ نغز ص ۲۹۴۔ ۲۹۵، ج-اول۔

اکرام نے لکھا ہے کہ انڈیا آفس کے اس قلمی تذکرے پر کوئی تاریخ درج نہیں [1] ہے اور یہ فیصلہ کرنا ممکن نہیں کہ نواب اعظم الدولہ کا ترجمہ غالب کس زمانے کا ہے۔ یہ بات بھی درست نہیں اس لیے کہ اس نسخہ کے خاتمے پر ایک چھوڑ تین تین تاریخیں درج ہیں۔

تذکرہ سرور کے آخر میں نظام الدین خاں ممنون کی تاریخ دی ہے۔ جو تاریخ پوچھی تو ممنون نے کہا "یہ ہے معیار نقد سخن"۔ ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۰ء)۔

بھولا ناتھ عاشق نے "باغ و بہار" سے تاریخ نکالی ہے:

مری بلبل طبع نے دیکھ عاشق
کہی اس کی تاریخ "باغ و بہار"

اس سے ۱۲۱۷ ہجری (جو مطابق ہے ۱۸۰۲ء) نکلتی ہے۔

اعظم الدولہ سرور کا بیان ہے کہ:

"این نسخہ نہم محرم الحرام ۱۲۲۴ ہجری (۱۸۰۹ء)
صورت اختتام پذیرفت۔" [2]

یہ امر یقینی ہے کہ تذکرہ کئی سال میں جا کر اختتام کو پہنچا ہوگا۔ اس لیے کہ اس میں تقریباً بارہ سو شعرائے اردو کا حال درج ہے، اور کافی ضخیم اور مبسوط ہے۔ آغاز تالیف کے متعلق کوئی بات پوری قطعیت کے ساتھ کہنا مشکل ہے لیکن تذکرہ میں بعض شہادتیں ایسی موجود ہیں جن کے پیش نظر یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اس کی ابتدا برخلاف صراحت اشپرنگر ۱۸۰۱ء سے پہلے ہو چکی تھی۔

۱۔ سرور نے خواجہ میر درد کے حال میں لکھا ہے:

"مدتے شد کہ بدار الجنان اقامت گزید۔" [3]

درد کا انتقال ۱۷۸۵ء (۱۱۹۹ھ) میں ہوا [4] ہے۔ سرور جس وقت تذکرہ

۱۔ آثار غالب ص ۲۲-۲۶ طبع چہارم ۲۔ تذکرہ اعظم الدولہ سرور ص ۷۸۸۔
۳۔ تذکرہ اعظم الدولہ سرور۔ ص۔ ۸۸۷۔ (مخطوطہ لندن)
۴۔ بیل۔ اورینٹل جیوگرافیکل ڈکشنری۔ بیدار نے تاریخ لکھی ہے "حیف دنیا سے سدھارا وہ خدا کا محبوب"

لکھ رہے تھے۔ درد کی وفات کو ایک مدت ہو چکی تھی۔ اعظم الدولہ نے میر قمر الدین منت کی رحلت کا سن دیا ہے۔

"در ۱۲۰۸ھ (۱۷۹۳ء) سفر آخرت گزید"۔

مولف نے آصف الدولہ کو بھی مرحوم لکھا ہے اور ان کے عین شباب میں مرنے پر اظہار افسوس کیا ہے۔

"آصف تخلص وزیر الملک مدار المہام آصف جاہ یحییٰ خاں آصف الدولہ بہادر ہزبر جنگ مرحوم۔ حیف کہ در عین شباب بہ سن چہل سالگی رخت اقامت ازیں عالم پر آشوب وفتن بربست"۔ [1]

تاریخ مظفری کی روایت کے بموجب انہوں نے اپچاس برس کی عمر پائی اور "وزیر نامے" سے ثابت ہے کہ وہ پچاس سال سے زیادہ عمر پا کر فوت ہوئے۔ اس کو عین شباب کہنا درست نہیں۔ آصف الدولہ کا انتقال ۱۷۹۷ء (۱۲۱۲ھ) میں ہوا ہے۔ اور اس میں اختلاف کی گنجائش نہیں [2] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تذکرہ سرور کی تالیف ۱۷۹۷ء کے بعد ہوئی ہو گی۔

۲۔ اعظم الدولہ نے بیان کا ذکر حالیہ صیغوں میں کیا ہے۔

"بیان تخلص خواجہ احسن الدولہ خاں شاگرد مرزا جان جاناں مظہر رحمتہ اللہ علیہ اصلش از کشمیر و مولد شاہجہاں آباد مرید جناب مخدومی حضرت مولوی محمد فخر الدین صاحب قدس اللہ سرہ از چندے بطرف حیدر آباد رفتہ در سرکار نواب نظام علی خاں مرحوم در ریختہ گوئی مشاق و خوش گواست و مربوط گو و فصیح البیان"۔

خم خانہ جاوید، گل رعنا اور جواہر سخن کی تصریح کے مطابق بیان کا انتقال ۱۲۱۳ھ (۱۷۹۸ء) میں ہوا ہے۔ مولانا عرشی نے یکتا کی دستور الفصاحت کے دیباچے

۱۔ تذکرہ سرور۔

۲۔ ملاحظہ ہو تاریخ اودھ ج۔۳ ص۔۲۵۰ اور فرح بخش مولفہ فیض بخش

میں " استاد از جہاں رفت" جو مادہ تاریخ نقل کیا ہے اس سے بھی یہی سن نکلتا ہے [1] دستور الفصاحت ۱۲۱۳ ہجری (۹۸،۱ء) سے پہلے لکھی گئی تھی، اس میں یکتا نے بیان کے متعلق لکھا ہے:

"می گویند کہ تا حال زندہ است" [2]

ان امور کے پیش نظر قرینہ غالب ہے کہ تذکرہ سرور آصف الدولہ کے انتقال (۹۷،۱ء) کے بعد اور بیان کی وفات (۹۸،۱ء) سے پہلے شروع کیا گیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ مولف کے دیتے ہوتے سال اختتام یعنی ۱۸۰۱ء تک پہنچنے میں حذف و اضافہ اور ترمیم و اصلاح کی بہت سی منزلوں سے گزرا ہوگا۔ بعض اندرونی شہادتوں سے بھی یہی نتیجہ مستنبط ہوتا ہے کہ یہ تالیف آغاز کے بعد کئی برس تک جاری رہی اور ۱۸۰۹ء میں انجام کو پہنچی۔

۱۔ سرور نے مکرم الدولہ بہادر کے انتقال کا سنہ ۱۲۱۸ ہجری (۱۸۰۳ء) دیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ اس مرحوم کے یہاں مشاعرے اور رقص کی محفلیں منعقد ہوتی تھیں۔

۲۔ سرور نے انشا کے بیان میں لکھا ہے:

" در ایامے کہ بسرکار مرشدزادہ آفاق مرزا سلیمان شکوہ بہادر در لکھنؤ ملازم بود، قصیدہ در تہنیت سال گرہ مرشدزادہ دام عمرہ موزوں نمودہ ہمہ پر از مضامین عالی است مطلعش این است۔"

صبح دم میں نے جو لی بستر گل پر کروٹ
جنبش باد بہاری سے گئی نیند اچٹ [3]

انشا ۱۲۱۵ ہجری (۱۸۰۰ء) تک مرزا سلیمان شکوہ کے ملازم رہے۔ یہ بیان اس کے بعد ہی کا ہو سکتا ہے۔

۱۔ دستور الفصاحت۔ ص۔ ۸۳، حاشیہ
۲۔ دستور الفصاحت۔ نیز دیباچہ عرشی ص۔ ۲۷
۳۔ تذکرہ سرور۔

۳۔ سرور نے بادشاہ دہلی شاہ عالم آفتاب کا ذکر بڑی عقیدت سے کیا ہے۔ اور اس کی سلطنت کی پائیداری کی دعا مانگی ہے۔ شاہ عالم کا انتقال ۱۸۰۶ء میں ہوا ہے۔

۴۔ اثر کے ترجمے میں لکھا ہے :

"... برادر کوچک حضرت خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ اشعار ہندی بہ صحت محاورہ می گفت از چندے ازیں جہان فانی رخت اقامت بربست۔" [۱]

اثر کا انتقال اتمام مجموعہ نغز یعنی ۱۸۰۶ء سے پہلے ہوا ہے۔

۵۔ سرور نے جرأت کا حال ان کی زندگی میں لکھا ہے :

" جرأت تخلص قلندر بخش۔ از چندے بسبب انقلاب مع قبائل بہ لکھنؤ رفتہ طرح اقامت انداخت۔ مصلح اشعار اکثر سکنائے لکھنؤ است۔ در علم نجوم نیز مہارت دارد و بعلم موسیقی ہم آشنا است، چنانچہ در نواختن ستار دستے دارد .... دریں زمانہ ہمچو شخص بسا مغتنم۔" [۲]

اہلِ تذکرہ کا اتفاق ہے کہ جرأت کا انتقال ۱۸۱۰ء میں ہوا ہے۔

۶۔ اسی طرح سرور نے میر کا ذکر اس انداز سے کیا ہے جو ان کی زندگی پر دلالت کرتا ہے۔ آصف الدولہ مرحوم کے ترجمے میں لکھتے ہیں :

"پرداخت و مراعات شعرا منظور نظر۔ داشت۔ چنانچہ میر محمد تقی متخلص بہ میر کہ در فن ریختہ گوئی سرآمد شعرائے وقتست بہ صیغہ شاعری دو صد روپیہ در ماہہ را ملازم بود۔" [۳]

میر کے ترجمے میں بھی لکھا ہے :

"فی الواقع مرتبہ شاعری او دریں زمانہ بسا بلند است۔" [۴]

۱۔ تذکرۂ سرور۔
۲۔ تذکرۂ سرور۔
۳۔ تذکرۂ سرور۔ ۴۔ تذکرۂ سرور۔

میر کی تاریخ وفات ناسخ کے اس مصرع سے "واویلا مرد شہ شاعراں" ۱۲۲۵ ہجری (۱۸۱۰ء) نکلتی ہے۔

سرور کے بیان اور "عمدہ منتخبہ" کی اندرونی شہادتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اس کی تکمیل ۱۸۰۹ء میں ہو چکی تھی، اور غالب کے کسی خط سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انہوں نے آگرہ کی سکونت ۱۸۱۱ء سے پہلے ترک کی ہو، بلکہ زیادہ شواہد اس بات کے ہیں کہ وہ ۱۸۱۳ء۔ ۱۸۱۴ء کے بعد آکر دہلی میں بسے ہوں۔

ان امور کے پیش نظر یہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ سرور نے مرزا غالب کے جو حالات لکھے ہیں اور ان کے جو اشعار نمونے کے طور پر نقل کیے ہیں وہ مرزا کے قیام اکبر آباد سے متعلق ہیں۔

اعظم الدولہ سرور نے "عمدہ منتخبہ" میں غالب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کا پورا متن یہ ہے:

"اسد تخلص، اسد اللہ خاں عرف مرزا نوشہ اصلش از سمرقند مولدش مستقر الخلافہ اکبر آباد جوان قابل و یار باش و دردمند، ہمیشہ بہ خوش معاشی بسر بودہ۔ ذوق ریختہ گوئی در خاطر متمکن غم ہائے عشق مجاز تربیت یافتہ۔ خم کدہ نیاز در فن سخن سنجی متبع محاورات مرزا عبدالقادر بیدل علیہ الرحمۃ و ریختہ در محاورات فارسی موزوں می کند۔ بالجملہ موجد طرز خود است و با راقم رابطہ یک جہتی مستحکم دارد اکثر اشعارش در زمین سنگ لاخ بمضامین نازک موزوں گشتہ رو بہ خیال بندی بیش از بیش پیش نہاد خاطر دارد۔"

اس متن کے متعلق چند باتیں عرض کرنا ضروری ہیں۔

۱۔ ڈاکٹر اشپرنگر نے "اکبر آباد" کا لفظ نظر انداز کر دیا ہے۔ [۱] اس کی وجہ سے انہوں نے سرور کے حوالے سے غالب کا مولد دہلی کو قرار دیا ہے، جو کسی طرح درست نہیں۔

۱۔ یادگار شعرا۔

۲۔ شیخ محمد اکرام نے "ذوق ریختہ گوئی" کا ٹکڑا حذف کر کے "عمہائے عشق مجاز" کا تعلق "خاطر" سے جوڑا ہے۔ جو درست نہیں ہے موصوف نے اس طرح لکھا ہے:
"ہمیشہ بہ خوش معاشی بسر بودہ ۔ در خاطر متمکن عمہائے عشق مجاز" [1]

۳۔ متن کے آخری جملے کو شیخ محمد اکرام نے اس طرح نقل کیا ہے۔
"روبہ خیال بندی بیش از پیش نہاد خاطر دار"۔
روبہ خیال بندی بھی اور پیش نہاد خاطر بھی یہ جملہ صحیح نہیں۔ موصوف کو پڑھنے میں سہو ہوا ہے۔ فارسی میں رویہ کے معنی ہیں دستور۔ چلن۔ طریقہ۔

سرور کے اس ترجمہ میں مندرجہ ذیل باتیں بھی غور طلب ہیں۔

۱۔ یہ ترجمہ اس زمانے کا ہے جب غالب بیدل کے طرز میں شعر کہتے تھے۔ ان کی ابتدائی شاعری کے متعلق اس سے بہتر رائے نہیں ہو سکتی۔
"ریختہ در محاورات فارسی موزوں می کند" یا "موجد طرز خود است" یا "اکثر اشعارش در زمین سنگ لاخ بمضامین نازک موزوں گشت، روبہ خیال بندی بیش از بیش نہاد خاطر دارد"۔

۲۔ سرور نے اس ترجمے میں اس کا ذکر نہیں کیا کہ غالب اب دہلی میں سکونت رکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ بات لکھنے کی تھی۔ کریم الدین تو سالہا سال کے بعد بھی اس کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں۔
"ابتدا میں درمیان اکبر آباد کے رہتے تھے اب شاہ جہاں آباد میں ۱۲۵۰ ہجری (۱۸۳۴ء) کے قبل سے رہتے [2] ہیں"
سرور بالعموم سکونت کا تذکرہ ضرور کرتے ہیں، مثلاً امید کے ترجمہ میں لکھتے ہیں ۔۔۔:
"اصلش از ایران و مسکنش شاہ جہاں آباد"۔
میر آمانی اسد کے متعلق لکھتے ہیں:

۱۔ آثار غالب (غالب نامہ) طبع چہارم۔ ص ۔ ۲۴
۲۔ تذکرۂ کریم الدین ۔۔ ص ۔۔ ۲۷۷

"از بس کہ بث اہ جہاں آباد ور کوچہ ارباب نشاط کہ مشہور محلہ دارا لخلافہ
است مسکن داشت۔"

احسن اللہ خاں احسن کے متعلق لکھتے ہیں:

"قریب دروازہ لاہوری دارالخلافہ در مسجد سر ہندی استقامت دارد۔"

اگر غالب اس زمانے میں دہلی میں اقامت گزیں ہوتے تو یہ مستبعد نہیں کہ سرور اس کی تصریح ضرور کرتے، جیسا کہ انہوں نے بعض دوسرے شاعروں کے باب میں کی ہے اور جیسا کہ غالب کے متعلق کریم الدین، میر محسن علی محسن، سرسید اور نساخ نے صراحتاً لکھا ہے کہ ان کا مولد اکبرآباد اور مسکن دہلی ہے۔ اس کے علاوہ سرور نے غالب کی "خوش معاشی" کا جو ذکر کیا ہے اور ان کی شاعری پر جو تنقید کی ہے وہ بھی اس کی غمازی کرتی ہے کہ یہ اندراجات غالب کے قیام آگرہ ہی سے متعلق ہیں:

سرور نے غالب کے مندرجہ ذیل اشعار نقل کیے ہیں:

شمشیر صاف یار جو زہر آب دادہ ہو
وہ خط سبز ہے کہ بر خسار سادہ ہو

دیکھتا ہوں اسے تھی جس کی تمنا مجھ کو
آج بیداری میں ہے خواب زلیخا مجھ کو

یہ دونوں اشعار نسخۂ حمیدیہ میں نہیں ہیں۔

آتے ہیں پارہ ہائے جگر اب میان اشک
لایا ہے لعل بیش بہا کاروان اشک

نسخۂ حمیدیہ میں میان کے بجائے درمیان ہے۔

آنسو کہوں کہ آہ سوار ہوا کہوں
ایسا عناں گسیختہ آیا کہ کیا کہوں

یہ شعر نسخۂ حمیدیہ میں موجود ہے۔

ہنستے ہیں دیکھ دیکھ کے سب ناتواں مجھے
یہ رنگ زرد ہے چمن زعفراں مجھے

دیکھ وہ برق تبسم بس کہ دل بیتاب ہے
دیدۂ گریاں مرا فوارۂ سیماب ہے
کھول کر دروازۂ مے خانہ بولا مے فروش
اب شکست توبہ میخواروں کو فتح الباب ہے

مجلس شعلہ عذاراں میں جو آ جاتا ہوں
شمع ساں میں تہ دامان صبا جاتا ہوں
ہووے ہے جادۂ رہ رشتہ گوہر ہر گام
جس گزرگاہ سے میں آبلہ پا جاتا ہوں
سرگراں مجھ سے سبک روکے نہ رہنے سے رہو
کہ بیک جنبش لب مثل صدا جاتا ہوں

اک گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے
رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے
پروانہ کا نہ غم ہو تو پھر کس لیے اسد
ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

جگر سے ٹوٹی ہووے ہو گئی سناں پیدا
دہان زخم میں آخر ہوئی زباں پیدا
مندرجہ بالا نو اشعار نسخۂ حمیدیہ میں موجود نہیں ہیں۔
خوباں کے چاہنے کے میں قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا
نسخۂ حمیدیہ میں پہلا مصرع اس طرح ہے:۔
عرض نیاز عشق کے قابل نہیں رہا

نیاز عشق خرمن سوز اسباب ہوس بہتر
جو ہو جاوے نثار برق مشت خار و خس بہتر
یاد آیا جو وہ کہنا کہ نہیں راہ غلط
کی تصور نے بصحرائے ہوس راہ غلط

یہ دونوں اشعار نسخۂ حمیدیہ میں نہیں ہیں۔

گلشن میں بند و بست بضبط دگر ہے آج
قمری کا طوق حلقۂ بیرون در ہے آج

یہ شعر نسخۂ حمیدیہ میں موجود ہے۔

اس جفا مشرب پہ عاشق ہوں کہ سمجھے ہے اسد
خون زاہد کو مباح اور مال صوفی کو حلال

نسخۂ حمیدیہ میں دوسرا مصرعہ اس طرح ہے۔

مال سنی کو مباح اور خون صوفی کو حلال

کہتا تھا کل وہ نامہ رساں سے بسوز دل
درد جدائی اسد اللہ خاں نہ پوچھ

اسد کو بوریے میں دھر کے پھونکا موج ہستی نے
فقیری میں بھی باقی ہے شرارت نوجوانی کی

یہ دونوں اشعار نسخۂ حمیدیہ میں موجود ہیں۔

شکل طاؤس گرفتار بنایا ہے مجھے
ہوں میں وہ دام کہ سبزے میں چھپایا ہے مجھے
ماہ نو ہوں کہ فلک عجز سکھاتا ہے مجھے
عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سلاتا ہے مجھے

یہ دونوں اشعار نسخۂ حمیدیہ میں نہیں ہیں۔

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے — سینہ جویائے زخم کاری ہے
پھر جگر کھودنے لگا ناخن — آمد فصل لالہ کاری ہے
قبلۂ مقصد نگاہ نیاز — پھر وہی پردۂ عماری ہے
چشم دلال جنس رسوائی — دل خریدار ذوق خواری ہے
وہی صد رنگ نالہ فرسائی — وہی صد گونہ اشک باری ہے
دل ہوائے خرام ناز سے پھر — محشرستان بے قراری ہے
جلوہ پھر عرض ناز کرتا ہے — روز بازار جاں سپاری ہے
پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں — پھر وہی زندگی ہماری ہے
پھر کھلا ہے در عدالت ناز۔ الخ

یہ اشعار سرور کے یہاں اس مقام پر نہیں ہیں۔ مندرجہ بالا غزل نسخۂ حمیدیہ میں ہے۔

کب سنے ہے وہ کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

نسخۂ حمیدیہ میں پہلا مصرع یوں ہے:

کیا وہ سنتا ہے کہانی میری

خلش غمزہ خوں ریز نہ پوچھ
دیکھ خونابہ فشانی میری
کیا بیاں کرکے مرا روئیں گے لوگ
مگر آشفتہ بیانی میری

بعض مطبوعہ نسخوں میں "لوگ" کے بجائے "یار" ہے۔

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
تجھ سے قسمت میں مری صورت قفل ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا
دل سے مٹنا تری انگشت حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

یہ غزل نسخۂ حمیدیہ میں موجود ہے۔

پھر کھلا ہے در عدالت ناز
گرم بازار فوجداری ہے
پھر ہوا ہے جہان میں اندھیر
زلف کی پھر سررشتہ داری ہے

نسخۂ حمیدیہ میں پہلا مصرع یوں ہے :
ہو رہا ہے جہان میں اندھیر

پھر دیا پارۂ جگر نے سوال
ایک فریاد و آہ و زاری ہے
پھر ہوئے ہیں گواہ عشق طلب
بے قراری کا حکم جاری ہے

نسخۂ حمیدیہ میں "بے قراری" کے بجائے " اشک باری" ہے۔

دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا
آج پھر اس کی روبکاری ہے
بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
ہوتے ہیں ملول اس کو سن کر جاہل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل۔

مطبوعہ دیوانوں میں اس رباعی کا دوسرا مصرع اس طرح ہے:

سن سن کے اسے سخن وران کامل

رباعی منقولہ سرور سے جوان سال غالب کی اس نفسیات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے جوان کے آگرہ کے قیام میں تھی۔ وہ ریختہ گو محاورات فارسی میں لکھنا اور بیدل کی پرپیچ شاعری کی تقلید ہی کو معراج سمجھتے تھے۔ اس لیے معترضین بھی ان کی رائے میں "جاہل" تھے۔ لیکن دوسرے مصرع کی تبدیلی جو مروجہ دیوانوں میں ہے صاف ظاہر کرتی ہے کہ انہوں نے اپنی غلطی کو محسوس کرلیا اور "سخن وران کامل" کی تنقید کے آگے سپر ڈال دی۔ یہ تبدیلی غالب کے ایک نئے اور بالیدہ ذہن کی طرف اشارہ کرتی ہے جو یقیناً دہلی کی آب و ہوا کا پروردہ ہے لیکن سرور نے جس طرح رباعی کو نقل کیا ہے وہ آگرہ کے قیام ہی کی یادگار ہوسکتی ہے۔

■■

مرزا غالب سے ایک ملاقات

"سیر دہلی" شیخ محمد ریاض الدین امجد کا مختصر سا سفر نامہ ہے۔ جس کا دوسرا تاریخی نام "سرورِ ریاض" ہے جس سے ۱۲۷۷ھ (۱۸۶۱ء) کے اعداد نکلتے ہیں۔ یہ ۴۲ صفحات کی مختصر سی کتاب ہے جو مطبع حیدری واقع آگرہ کٹرہ حاجی محمد حسن مرحوم باہتمام مرزا علی حسین طبع ہوئی۔ ابتدا میں مصنف کی تمہید ہے۔ آخر میں آغا حسین کی تقریظ اور حاتم علی مہر مرزا عنایت علی ماہ عزیز الدین اکرم تجلی کے تاریخی قطعات درج ہیں۔

سفر کی غرض و غایت خود مسافر ہی سے سنیے:

"مدت سے دل میں شوق تھا کہ دلی سے جو متھرا کے قریب ہے، کچھ بعید نہیں، جائیں اور شہر کو آنکھوں سے کہ قابلِ دید ہے دیکھ آئیں ــــ زمانۂ انقلاب سے پہلے ایک میرے چھوٹے بھائی ــ مولوی نیاز علی سلمہٗ بذریعہ عہدہ سب ڈپٹی انسپکٹر کے سررشتہ تعلیم میں تھوڑے عرصہ تک بہت لطف کے ساتھ دہلی میں قیام پذیر تھے۔ لیکن جب موقع ہاتھ نہ لگا، بے سروپا بیٹھا رہا۔ علاوہ اس کے کسی نے یہ خبر سنائی کہ تبدیلی ان کی ضلع رہتک میں عمل میں آئی۔ بعد اس کے فتنہ و فساد نے سر اٹھایا۔ مجبور بیٹھا رہا، قدم نہ ہلایا ــ آخر کار جب آتش فتنہ و فساد مندفع ہو کر زمانہ اصلی وضع پر آیا تو دل نے بیٹھے بٹھائے وہی ولولہ اٹھایا اور اس عرصہ میں یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کے افسر نے ان کو دہلی میں مدرس مدرسہ تعلیم المعلمین مقرر فرمایا ہے۔ الحاصل یہ ارادہ مصمم ہوا کہ اسی ۱۸۶۰ء کی تعطیل محرم میں جاؤں اور دلی دیکھ آؤں۔ ہر چند یہ بھی خیال آیا کہ اب شہر اجڑ گیا ہے، ویسا نہیں رہا، جانا بیکار ہے، پھر سوچا کہ خدا تصور کو سلامت رکھے، ویرانہ کو

دیکھیں گے، آبادی کا تصور کر لیں گے، آدمی کم ہو گئے ہوں گے، مکانات تو وہی رہے ہوں گے۔ الغرض جب یہ قصد مصمم ہو چکا تو پھر یہ سوجھی کہ دلی جاؤ گے، کیا کیا لاؤ گے۔ کسی روز کوئی کہے گا کہ دلی سے کچھ لاتے یا ویسے ہی چلے آتے تو کیا کہو گے؟ اس لیے یہ تجویز ہوئی کہ دلی میں جو کچھ دیکھوں اور سنوں وہ لکھ کر احباب کی نذر کروں۔ خصوصاً مولوی روح اللہ، یہ صدر دیوان اضلاع مغربی و مشرقی کے وکیل ہیں۔ ان کو بطریق تحفہ اور ہدیہ کے دوں اور کہوں کہ بھئی دلی سے آتے ہیں اور یہ تحفہ لاتے ہیں۔"

مصنف کے بارے میں کوئی اطلاع نہ مل سکی۔ اسی سفر نامے سے جو کچھ معلوم ہو سکا وہ یہ ہے۔ پورا نام ریاض الدین امجد ہے۔ معلوم نہیں امجد تخلص ہے یا کیا۔ غزلوں میں تو ریاض تخلص ملتا ہے۔ ممکن ہے دونوں تخلص ہوں۔ اصل وطن سندیلہ تھا۔ قیام متھرا میں تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی مولوی نیاز علی دہلی کے سررشتہ تعلیم میں سب انسپکٹر تھے۔ پھر ۱۸۶۰ میں مدرسہ مدرسہ تعلیم المعلمین مقرر ہوئے۔ کتاب کی نثر میں بڑی شوخی اور رنگینی ہے۔ خوبصورت لڑکیوں اور طوائفوں، کسبیوں کا ذکر بڑے ذوق و شوق، گہرے خلوص اور بے حد دلچسپی سے کرتے ہیں اور صفحے کے صفحے اس "ذکر انور" پر خرچ کر دیتے ہیں۔ راقم کی رائے میں تو اس سفرنامے سے سب سے اچھی روشنی اس بات پر پڑتی ہے کہ ۱۸۶۰ء میں دہلی کی مشہور طوائفیں کون سی تھیں، اور ان کا رنگ ڈھنگ، طور طریقہ، پوشاک اور وضع قطع کیا تھی۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ سفرنامہ کی ترتیب کے وقت مصنف شباب کی مستیوں سے سرشار تھا۔ اور عبارت کی رنگینی اور شوخی کی اصل وجہ یہی ہے۔ کتاب میں رواج زمانہ کے مطابق اشعار بھی کثرت سے نقل کیے ہیں اور یہ زیادہ تر خواجہ وزیر کے ہیں۔ اس سے ان کی وزیر سے دلچسپی کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے علاوہ مرزا اعظم، ناسخ، خواجہ درد، انیس، آتش اور نظیر کے اشعار بھی درج کیے ہیں۔ دہلی میں انہوں نے دس دن قیام کیا۔ جن جن لوگوں سے ان کی ملاقات ہوئی ان میں حکیم عبدالرحیم، مولوی قطب الدین، خواجہ علی احمد، میر بادشاہ صاحب منصف سکندر آباد، حافظ عبدالصمد، بدرالدین علی خاں مہر کن، نقشی قابل ذکر ہیں۔

مذکورہ بالا اصحاب کے سوا مصنف نے جن کا ذکر سب سے زیادہ تفصیل سے کیا ہے وہ مرزا غالب ہیں۔ ان کا ذکر کتاب میں تین مقامات پر آیا ہے۔ دو جگہ ان سے اپنی ملاقات کا حال بیان کیا ہے، اور ایک ۱ جگہ صرف سرسری سا ذکر آیا ہے۔

مرزا غالب سے مصنف کی دو ملاقاتیں انہیں کے گھر پر ہوئی تھیں۔ شعر و سخن کے چرچے ہو رہے تھے۔ انہیں ہنستے، بولتے، اٹھتے، بیٹھتے دیکھا تھا اور محسوس کیا تھا۔ اسے ضبط تحریر میں لے آئے تھے۔ اب تک جن لوگوں سے مرزا کی ملاقات کا حال معلوم ہوا ہے، اس میں یہ ملاقات اور اس کے اندراجات سب سے قدیم ہیں۔ اس لیے بہت اہم ہیں۔

اب اس تمہید کے بعد خود مصنف سے مرزا غالب کی ملاقات کا حال سنیے۔

بیان قلعہ معلیٰ میں جانے کا اور جناب مستغنی عن الالقاب مرزا اسد اللہ خاں غالب دام افضالکم کی ملاقات سے لطف اٹھانے کا۔"

"چھبیسویں جولائی (۱۸۶۰ء مطابق ۶ محرم ۱۲۷۷ھ) کو صبح کو اٹھا، دہلی کے قلعے

۱ــ مصنف انقلاب کے چند ہی سال بعد دہلی گئے تھے وہاں عمارتوں اور اشخاص پر تباہی و اضمحلال کے اثرات بہت گہرے تھے۔ ایک جگہ اس کا ذکر کرتے ہوتے لکھتے ہیں:

"سچ پوچھو تو یہاں ہر ماہ محرم ہے۔ ہر دم تازہ غم و الم ہے۔ اب بھی قدیم مکانوں میں محفلیں ہوتی ہیں۔ جیسے حامد علی خاں اور عالیہ بیگم کے یہاں۔ سو وہاں بے سروسامانی ہے۔ بڑی پریشانی ہے۔ جہاں بڑی تیاری کے علم تھے۔ اب ان کا نشان بھی نظر نہیں آتا۔ یوسف مرزا اور حسین مرزا کے یہاں افسردگی ہے لیکن دن کو محفل قرینے سے ہوتی ہے۔ وہی بقول جناب فیض مآب اسد اللہ خاں کے، ارے بھئی، مرثیہ لکھیں تو ایک کا لکھیں۔ نوحہ کیجیے تو دو کا کیجیے جب تمام شہر برباد ہو کر بگڑ جاتے تو خاک بن آتے۔" ص ۔ ۴۴

میں اکبرآبادی دروازے سے پہنچا۔ یہاں پہلے چھوٹے کچے پکے مکان ہندوستانی طور کے غریبوں نے اور بڑے بڑے انگریزی وضع کے بادشاہ زادوں اور امیروں نے بناتے تھے۔ ہر طرح کا تکلف تھا، خوب سجا تھا لیکن بہ نظر صفائی ان کو سرکار اید اقتدار نے مسمار کر دیا، میدان ہموار کر دیا۔ وہاں سے کلکتہ دروازہ سے نکل کر سرن داس کے باغیچہ کے نیچے ہو کر نتے پل کے اوپر پہنچا۔ بعد اس کے ہوا کھاتے ہوتے بادل پورہ میں گیا۔ پھر منصور علی خاں کی حویلی میں کہ اب بھی وہاں عمارت وسیع اور مکانات رفیع دروازہ عالی شان مکلف مکان صحن کشادہ صاف گلی کوچہ شفاف موجود ہیں، لیکن آدمی مفقود ہیں، ہوتا ہوا بیگم کے باغ میں آیا۔ یہ باغ بہت آراستہ پیراستہ پایا۔ اب "کمپنی باغ" اس کا نام ہے۔ کیف کا مقام ہے ——

ہر طرف آبشاریں رواں ہیں۔ روشوں کے کناروں پر دوب لگائی ہے اپنی رنگت جمائی ہے۔ غرض کہ آم اور جامن اور مولسری کے پرانے پرانے پیڑ تھے اور نیچے درختوں کے گرے ہوتے پھولوں کے ڈھیر تھے۔ خدا بخش نے دو چار سو پھول اٹھاتے اور ایک ہار گوندھا، تین گجرے بنائے اور تھوڑے سے مرزا نوشہ کے مکان پر، جس کا ذکر آتے گا، گر پڑے، سو وہیں چھوڑ آتے۔ وہاں سے خواص پورہ میں جہاں عوام لوگوں کی بستی تھی، اور علی الخصوص میاں نیاز علی نے پہلے پہل یہاں سکونت کی حویلی لی تھی، پہونچا۔ وہاں سے سرائے میں آیا۔ یہاں تین دروازے عالی شان ہیں اور ایک دروازہ ہے۔ اس میں خدا بخش خیاط کی دوکان ہے۔ اب بھی چار پانچ وہاں بڑے بڑے مکان ہیں۔ پھر چاندنی چوک میں ہوتا ہوا بلی ماروں میں ہو کر شیر افگن خاں کی بارہ دری میں جہاں نواب اسداللہ خاں غالب عرف مرزا نوشہ رہتے تھے، گیا۔ مرزا کی ملاقات سے شرف یاب سعادت ہوا۔ سبحان اللہ ذات جامع الکمالات کے اوصاف خارج از شرح و بیان ہیں۔ یہ سرآمد زبان دانان شیراز و صفاہان ہیں، مغتنمات روزگار نفیس الطبع، قدیم الوضع عالی وقار والا تبار، ناخدائے سفینۂ سخنوری، دریکتائے بحر معنی پروری، آسمان و

زمین ذی کمالی، نردبان بام نازک خیالی، مجموعہ اوراق خردمندی، شیرازۂ اجزائے جرائد معنی بندی، مہر سپہر بلاغت اسد بیشۂ فصاحت، رشک انوری روشن طالب، حق تو یہ ہے کہ شعرائے ماضی و حال ہر فن شاعری میں غالب۔"

قد میانہ نہیں بلکہ دراز۔ اکبرآباد کے سارے انداز، کترے ہوتے سفید کچھ سیاہ ڈاڑھی کے بال، گورے چِٹّے خوبصورت، بدرجہ کمال لازالت شموس بلاغتہ طالعًا وغمام فصاحتہ متقاطرًا۔ میاں نیاز علی نے میری طرف اشارہ کیا کہ یہ بھی شاعر ہیں۔ اس فن میں کچھ کچھ ماہر ہیں۔ فرمایا کہ کچھ سنائیے۔ طبع کے جوہر دکھلائیے۔ غرضیکہ ہیچ مدان نے دو غزلیں ایک فارسی اور دوسری اردو کی سنائیں، مرزا نے ستائش جس کے سزاوار نہ تھا فرمائی:

غزل فارسی

شنیدم از صبا مے آید اینک شہسوار من
زباں دادم کہ برخیزد بہ تعظیمش غبار من
نمی آید صبا اکنوں زمدتے بر مزار من
غبار خاطر او گشت شاید ایں غبار من
گداز اے باغباں مارا گماں دزدی مبر ظالم
کہ گلہا نیستند این لخت دل اندر کنار من
بدامادی سخن پرواز آں نو کتخدا ہستم
عروس فکر ہر شب مے نشیند در کنار من
ریاض از آرزوئے وصل آں گل چاک گردیدم
کہ ایں سودا چو آتش سوخت آخر مشت خار من

غزل اردو

پھر وہ آتے گھر میں مجھ ناکام کے
کٹ گئے دن گردش ایام کے

وہ اٹھے پہلو سے ہم بیٹھے رہے
دل کو سینہ کو جگر کو تھام کے

لاتے ہاتھوں ہاتھ اہل کارواں
ورنہ ہم تھے ایک دو ہی گام کے

ہاتھ اٹھاؤ ہمنہ بانِ قافلہ
اور ہیں ہم ایک دو ہی گام کے

عشق جس کو ہے وہی انسان ہے
ورنہ یہ سب آدمی ہیں نام کے

یہ صدا تے قیس تھی اور جذبِ شوق
ناقۂ لیلیٰ کو ٹھہرا مقام کے

تپ سے اک فرحت ہے تیرے عشق میں
ولولہ ہیں ابخرے سرسام کے

خوب لکھی ہے غزل تم نے ریاض
کیوں نہ ہو قابل ہو تم انعام کے

اور اسی غزل میں مرزا کے ایک شعر میں دوسرا شعر ملا کر چار مصرعوں کا قطعہ بنایا تھا، خیر وہ بھی سنایا:

اب نہیں ہیں آپ کے مصرف کے ہم
رات کے دن کے نہ صبح و شام کے

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

جب یہ زبان پر لایا تو مرزا نے برجستہ فرمایا کہ "ارے بھئی چپ رہو، یوں کہو کہ "ضعف نے غالب نکما کر دیا" یا "دہر نے غالب نکما کر دیا"۔ عشق کیسا عاشقی کا وہ زمانہ نہ رہا۔ پھر ارشاد کیا کہ ریختی زبان میں اچھے معنیٰ نکالتے ہو۔ خاصے شعر ڈھالتے ہو۔ الحاصل دلی کے ثقات لکھنؤ کے حضرات، ہندو مسلمان پیر و جوان بلکہ ایک لڑکا بھی خیرآباد کا رہنے والا آفت کا پرکالہ مولوی فضل حق کا نواسا سن میں ذرا سا

قطبی میر پڑھتا، بات بات پہ لڑتا جھگڑتا، حاشیہ نشینان بساطِ ادب تھا۔ اہلِ کمال سب کے سب تھے۔ بعدہ مرزا نے تین بند مرثیہ کے اپنی تصنیف کے سنائے۔ لوگ روتے، پیٹے، چلائے۔ وہ بند میں نے طلب کیے۔ مرزا نے اپنے دستِ خاص سے لکھ کر دیے۔

مرثیہ

ہاں اے نفس بادِ سحر شعلہ فشاں ہو
اے دجلۂ خوں چشمِ ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قم لبِ عیسیٰ پہ فغاں ہو
اے ماتمیانِ شہ معصوم کہاں ہو

بگڑی ہے بہت بات بناتے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگاتے نہیں بنتی

تابِ سخن و طاقتِ غوغا نہیں ہم کو
ماتم میں شہ دیں کے ہیں سودا نہیں ہم کو
گھر پھونکنے میں اپنے محابا نہیں ہم کو
گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو

یہ حرگہ نہ پایہ، جو مدت سے بچا ہے
کیا خیمہ شبیر سے رتبہ میں سوا ہے

کچھ اور ہی عالم نظر آتا ہے جہاں کا
کچھ اور ہی نقشا ہے دل و چشم و زباں کا
کیسا فلک اور مہر جہاں تاب کہاں کا
ہو گا دلِ بے تاب کسی سوختہ جاں کا

اب مہر میں اور برق میں کچھ فرق نہیں ہے
گرتا نہیں اس رو سے کہو برق نہیں ہے

(۲)

(دوبارہ حاضر ہونا اسد اللہ خاں غالب کی خدمت میں)

"یکم اگست ۱۸۶۰ء (۱۲ محرم ۱۲۷۷ھ) جناب مستغنی عن الالقاب اسد اللہ خاں غالب کے مکان پر آیا۔ انہوں نے اگلے پچھلے آگرے کے باشندوں اور میلوں کا تذکرہ فرمایا۔ فارسی کا دیوان دکھایا، اور میر طالب علی اور میر نیر الدین حسین اور منور علی شاہ اور مرزا تقی بیگ کو توال اور دیگر عمال کے جلسوں کا جو آگرہ میں گزرے ہیں، جس عہد میں یہ بھی آگرے میں تھے، سنایا۔ دیر تک حاضر رہا اور دل میں یہ کہا کہ کیا خدا کی قدرت ہے۔ زمانہ کہیں جوہر سے خالی نہیں رہتا۔ دو چار اہل کمال سب جگہ موجود ہیں۔ زمان ماتقدم میں کیسے کیسے فاضل اجل، شاعر بے بدل اس شہر میں ہوتے گئے اور اس خلوت کدے میں سوتے گئے۔ اب صرف مرزا کا دم ہے سو خدا قائم رکھے، اس شہر میں دائم رکھے۔"

اب اس تحریر کے متعلق بعض قابل ذکر باتیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

" بیگم کا باغ، اس کا نام ملکہ کا باغ بھی ہے یہ باغ جہاں آرا بیگم نے ۱۰۶۰ھ میں بنوایا تھا، جو چاندنی چوک کے بازار میں گھنٹہ گھر کے سامنے ہے۔ بعد میں میونسپل کمیٹی کے دفاتر یہاں کی عمارتوں میں آتے تھے۔ اس لیے لوگ اسے 'کمپنی باغ' بھی کہتے ہیں۔ تفصیل کے لیے دیکھیے۔ واقعات دارالحکومت دہلی۔ ۲/۲۲۹۔

شیر افگن کی بارہ دری ۔ محلہ بلی ماراں میں متعدد گلیاں اور حویلیاں ہیں داہنی طرف گلی سوداگران حویلی حسام الدین حیدر۔ یہیں سے گلی قاسم جان کو راستہ جاتا ہے۔ بارہ دری شیر افگن بھی یہیں پر ہے۔ بارہ دری اب نہیں رہی۔ گلی اسی نام سے مشہور ہے۔ واقعات۔ ۲/ ۲۱۰۔ بلی ماران کے لیے دیکھیے۔ ۲۳۸۔

ریاض کی فارسی و اردو غزلیں نہایت معمولی ہیں اور اگر واقعی غالب نے ستائش کیا معنی، پوری غزلیں سن بھی لیں تو ان کی مہمان نوازی اور ان کے اعلیٰ اخلاق کی

یہ کھلی دلیل ہے۔

مرزا آخر میں اپنے مصرع "عشق نے غالب نکما کر دیا" میں عشق کو "ضعف" سے بدل دیا کرتے تھے۔ برکات حسن دہلوی کے ساتھ بھی ایسا ہی قصہ ہوا۔

مرزا نے سننے کو غزل سن تو لی لیکن ان دو جملوں میں نہایت خوبصورت تنقید بھی کر دی کہ رعایتِ زبان (رعایت لفظی) میں اچھے معنی نکالتے ہو، خاصے شعر ڈھالتے ہو۔

مرثیہ کے یہ تین بند صفیر بلگرامی نے بھی درج کیے ہیں لیکن ریاض کو تقدم زمانی حاصل ہے۔ اس سے اس مرثیہ کا زمانہ تصنیف ۱۸۶۰ء یا اس سے پہلے ہو جاتا ہے۔ دبیر کی مرثیہ نگاری اور اس کی فوقیت کا اظہار یہاں بھی موجود ہے۔ حیرت ہے کہ وہ انیس کا نام نہیں لیتے۔ صفیر کے سامنے اگر وہ دبیر کا نام لیتے ہیں تو اس کی تو کچھ وجوہ اور ہو سکتی ہیں لیکن یہاں تو کسی تاویل کی گنجائش نہیں۔

۱۸۶۰ء تک مرزا کا دیوان فارسی صرف ایک ہی بار شائع ہوا تھا۔ اس لیے مرزا نے ریاض امجد کو اپنے دیوان فارسی کی پہلی اشاعت (۱۸۴۵ء) دکھائی ہوگی۔

■■

سید احتشام حسین

مرزا غالب کے چار خط

غالب کی زندگی، شخصیت اور شاعری سے جو دلچسپی عام طور پر لی جا رہی ہے، اس کی وجہ سے ان کے متعلق جستجو، تحقیق اور تنقید کا سلسلہ جاری ہے اور برابر کچھ نہ کچھ ایسا مواد ملتا جا رہا ہے جو ہماری معلومات میں اضافے کا سبب بن جاتا ہے۔ مجھے خود غالب کے قلم کے لکھے ہوئے جو چار خط دستیاب ہوتے ہیں، ان کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک ایسے مکتوب الیہ کے نام ہیں جس کے متعلق اب تک کسی کو کوئی اطلاع نہ تھی۔ کچھ دن پہلے جب یہ دولت میرے ہاتھ لگی تو میں حیرت زدہ رہ گیا۔ اور میں نے احتیاطاً ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، منشی مہیش پرشاد مرحوم، قاضی عبدالودود، پروفیسر مسعود حسن رضوی اور بعض دوسرے حضرات سے دریافت کیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ خط میرے لیے ہی نئے ہوں۔ اور جب یہ یقین ہو گیا کہ نہ صرف یہ خط نئے ہیں بلکہ مولوی نعمان احمد مرحوم یعنی مکتوب الیہ کی بھی خبر کسی کو نہیں تو میں نے مکتوب الیہ کے حالات اور تقریب مراسلت کی جستجو شروع کی۔ جو کچھ معلوم ہوا ہے اسے مع خطوں کے شائع کر رہا ہوں۔ اس سلسلے میں عزیزی وقار احمد (مولوی نعمان احمد مرحوم کے پرپوتے) اور حکیم سید احمد صاحب ابن مولوی نعمان احمد مرحوم کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انہیں کی وساطت سے یہ خط بھی ملے اور حالات بھی معلوم ہوئے۔

مولوی نعمان احمد مہیوا ضلع سیتاپور کے تعلقہ دار تھے۔ مہیوا سیتاپور سے اٹھارہ انیس میل شمال مغرب کی جانب واقع ہے۔ یہ علاقہ مولوی مظہر علی کو ۱۸۵۷ء کے بعد ملا تھا۔ راجگان و تعلقہ داران اودھ کے مختلف تذکروں میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ تعارف کے لیے صرف ایک کتاب سے عبارت نقل کی جاتی ہے۔

نمبر-۲۴۲- مولوی مظہر علی تعلقدار مہیوا قوم شیخ۔ یہ ملکیت راجہ لونی سنگھ متولی کی بوجہ سرکشی ایام غدر، ۱۸۵۷ء ضبط ہو کر بحق خدمت گذاری سرکار گورنمنٹ انگلشیہ سے رئیس حال کو مالکانہ طور پر عطا ہوئی۔ دو موضع جمعی ۲۰۹۵ روپیہ ضلع سیتاپور میں واقع ہے۔ اس خاندان میں اولاد اکبر وارث ریاست ہوتا ہے۔ صفحہ- ۹۱۔

(تواریخ معہ تصاویر راجگان و تعلقداران اودھ-
مولفہ داروغہ حاجی عباس علی- گورنمنٹ پنشنر-
مطبوعہ نولکشور ۱۸۸۰ء)

یہ مولوی مظہر علی زمانیہ ضلع غازی پور کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد مولوی رفیع اللہ زمانیہ ہی میں پیدا ہوتے۔ ورنہ ان کا خاندان مرشد آباد سے تعلق رکھتا تھا اور ان کے بزرگ وہیں منصب قضا پر فائز تھے۔ اس معزز گھرانے کا تعلق بہار کے مشہور مقام منیر شریف سے بھی تھا۔ اور ہر جگہ علم و فضل کا چرچا تھا۔ چنانچہ مظہر علی نے بھی تحصیل علم کے وہی طریقے اختیار کیے جو اس دور سے پہلے طالبان علم کا شیوہ رہا تھا۔ انہوں نے کچھ تعلیم غازی پور میں حاصل کی۔ پھر سہسرام گئے۔ مگر کچھ دنوں بعد بددل ہو کر وہاں سے چلے آئے اور باپ سے اجازت لے کر ہندوستان کے مختلف علمی مرکزوں میں اپنی پیاس بجھائی۔ کچھ دنوں کے بعد جامعہ ازہر (مصر) چلے گئے۔ مگر وہاں بھی سیری نہ ہوئی۔ ہندوستان لوٹ کر مولوی عبدالرحیم کلکتوی کے درس میں شریک ہوتے۔ یہ بزرگ اشراقیین میں سے تھے، اور مولوی مظہر علی بھی اشراقیت سے متاثر ہوتے۔ کلکتہ کے دوران قیام وہ مدرسہ عالیہ میں بھی جایا کرتے تھے اور وہاں طلبا کو ایسی باتیں بتایا کرتے تھے جو ان کے اساتذہ کو بھی معلوم نہ تھیں۔ رفتہ رفتہ یہ بات انگریز پرنسپل تک پہنچی۔ جب مولوی مظہر علی سے اس کی ملاقات ہوئی تو وہ بہت متاثر ہوا۔ اور اسی کی فرمائش پر انہوں نے "اصول العلوم" کے نام سے ایک رسالہ لکھا جو چند سال قبل تک ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے کتب خانے میں موجود تھا۔ اور مولوی مظہر علی کے پوتے حکیم سید احمد صاحب نے دیکھا تھا۔ اس رسالے کے علاوہ انہوں نے ایک تفسیر اور ایک کتاب "تحقیق لفظ سبحان" کے نام سے لکھی۔ اب

یہ کتابیں کہاں ہیں، ان کی خبر نہیں۔

مولوی مظہر علی شاعر بھی تھے۔ لیکن ان کے کلام کا بھی کوئی مجموعہ موجود نہیں ہے۔ ان کے کچھ اشعار مولوی حکیم سید احمد صاحب کو یاد ہیں جو موصوف نے سناتے۔ ایک قطعہ تاریخ جس کی اہمیت تاریخی ہے، درج کیا جاتا ہے۔ مولوی مظہر علی مہاراجہ کشمیر کے یہاں قاضی تھے۔ اسی زمانے میں عہد جہانگیری کے ایک چشمے یا کنویں کی از سر نو مرمت کرائی گئی، جو خشک ہو گیا تھا۔ اس کی تاریخ تعمیر کلیم آملی نے یوں نکالی تھی:۔

دوش دیدم نشستہ بر کرسی شاہ مرداں علی جمجاہی
گفتمش السلام، گفت علیک گفت دیگر بگو چہ می خواہی
گفتم از بہر چشمہ تاریخے گفت بر گوئے "کوثر شاہی"
۱۰۴۲ھ

مولوی مظہر علی نے اپنے عہد میں یہ قطعہ تاریخ لکھا:

چشم بد دور چشمہ ایست کہ ہست
آب و تابش زماہ تا ماہی
بر سبیلش نہادہ سر تسنیم
سلسبیلش نمودہ ہمراہی
بود خاکش بہ سر ز حسرت شاہ
آبش افزود شیخ جمجاہی
پیش ازیں کلک تر زبان کلیم
درفشاں شد کہ کوثر شاہی
سال تاریخ حال "چشمہ شیخ"
گفت مظہر ز روئے آگاہی

۱۲۵۲ھ

غزل اور مثنوی کے جو اشعار حکیم صاحب موصوف نے سنائے ان سے بھی ان کی خوش ذوقی، قادر الکلامی اور رنگین بیانی کا اندازہ ہوا۔ حکیم صاحب نے مولوی

مظہر علی اور مولوی فضل خیرآبادی کے بعض علمی مناظروں کا بھی ذکر کیا۔ جن کا تذکرہ یہاں بے سود ہوگا۔ مولوی مظہر علی کا انتقال ۱۸۸۸ء میں ہوا۔ چونکہ وہ لاولد تھے اس لیے ان کے بھتیجے مولوی نعمان احمد ان کی جگہ پر تعلقدار ہوتے۔

مولوی نعمان احمد مولوی مظہر علی کے بھائی مولوی سبحان احمد کے بیٹے تھے۔ ان کا تاریخی نام چراغ احمد تھا۔ اس سے ۱۲۵۷ ہجری برآمد ہوتے ہیں۔ اس طرح ان کی تاریخ ولادت ۱۸۴۱ء قرار پاتی ہے۔ وہ بے حد خوبصورت بارعب اور جسیم انسان تھے۔ ان کا وزن تقریباً ساڑھے تین من اور قد چھ فٹ سے زیادہ تھا۔ ابتدائی تعلیم کے بعد وہ بنارس چلے گئے اور وہاں مولوی محمد حسین صاحب سے کسب فیض کیا۔ چونکہ فارغ البالی تھی اس لیے تحصیل علم ہی کی طرف متوجہ رہے اور تمام علوم متداولہ میں دسترس حاصل کی۔ علم طب میں دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ ان کا حافظہ غیر معمولی تھا۔ اور فارسی کا ذوق بے پایاں تھا۔ چونکہ فارسی نظم و نثر پر قدرت رکھتے تھے۔ کبھی کبھی اردو میں بھی شعر کہتے تھے۔ لیکن ان کے کلام کا کوئی بھی حصہ محفوظ نہیں ہے۔ علم طب کے متعلق ایک کتاب لکھی تھی جو اب موجود نہیں ہے۔ مولوی نعمان احمد کا انتقال ماہ اپریل ۱۹۰۲ء میں ہوا۔ مرحوم کے تین بیٹوں سلطان احمد، عمران احمد اور سید احمد میں سے سید حکیم احمد صاحب جو عمر میں سب سے چھوٹے ہیں، خدا کے فضل سے ۱۹۶۰ء تک بقید حیات رہے۔ نوے سال کے قریب عمر تھی۔ فارسی اور اردو کے اچھے شاعر تھے مگر کلام کی اشاعت سے پرہیز کرتے تھے۔ اساتذہ فارسی و اردو کے ہزارہا اشعار اور لطائف یاد تھے اور بڑی دلکشی سے انہیں بیان فرماتے تھے۔ اپنے علم و فضل کے لحاظ سے ایک علم دوست خانوادہ کی سچی نمائندگی کرتے تھے۔ موصوف نے بڑی خندہ پیشانی سے اپنے خاندان کے حالات اور خطوط غالب کے متعلق ضروری باتیں مجھے بتائی تھیں۔

حکیم سید احمد صاحب فرماتے تھے کہ مولوی نعمان احمد مرحوم کے تعلقات راجگان محمود آباد سے بہت اچھے تھے، اور اکثر آمد و رفت رہتی تھی۔ مولوی نعمان احمد کو اپنی فارسی انشا پردازی پر یک گونہ فخر تھا۔ ایک دفعہ محمود آباد ہی میں قیام تھا، مولانا قدر بلگرامی بھی تشریف رکھتے تھے، فارسی انشا پردازی اور خطوط نویسی

کا ذکر آیا تو مولوی نعمان احمد نے اپنے بعض خط اور رقعے سنائے۔ قدر بلگرامی جن کے کانوں میں غالب کا اندازِ تحریر بسا ہوا تھا، بول اٹھے کہ اگر آپ کو واقعی اپنی فارسی تحریر کی داد لینا مقصود ہے تو غالب کو خط لکھیے۔ اگر وہ پسند کریں تو سمجھیے کہ آپ انشا پرداز ہیں، کیونکہ اس وقت غالب سے بہتر کوئی فارسی نظم و نثر کو پرکھنے والا نہیں ـــ اس طرح مولوی نعمان احمد نے غالب کے نام فارسی میں خط لکھا۔ انہیں امید تھی کہ غالب بھی فارسی میں جواب دیں گے، لیکن غالب نے اردو میں جواب دیا، جس کی وجہ سے مولوی نعمان احمد کو فرمائش کرنی پڑی کہ وہ فارسی میں جواب دیں۔ دوسرے خط میں غالب نے اس کی معذرت کی ہے لیکن غالب کے خط کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے مولوی نعمان احمد کے اندازِ نگارش کو پسند کیا اور جب انہیں شک ہوا کہ کہیں غالب نے یوں ہی مجھے رئیس سمجھ کر خوش کرنے کے لیے تعریفی کلمات نہ لکھ دیئے ہوں، تو غالباً انہوں نے اپنے دوسرے خط میں اس شک کا اظہار غالب سے بھی کر دیا اور غالب کے دوسرے خط کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں یہ بات پسند نہ آئی۔ اپنی صفائی پیش کی اور دوبارہ انہیں ان کی فارسی نویسی کی داد دی۔ یوں غالب کے یہ چار خط جو بعض حیثیتوں سے بہت اہم ہیں، مولوی نعمان احمد کے نام لکھے گئے۔

حکیم سید احمد صاحب کا خیال ہے کہ غالب کے یہی چار خط ان کے والد مرحوم کے نام آئے، کیونکہ وہ بچپن سے انہیں کو دیکھتے آئے ہیں۔ جیسا کہ ان خطوں کے مطالعے سے معلوم ہوگا۔ یہ خط غالب کی عمر کے آخری دنوں میں لکھے گئے۔ ۵ ستمبر ۱۸۶۶ء سے شروع ہو کر یہ سلسلہ ۱۷ دسمبر ۱۸۶۶ء تک ختم ہو گیا۔ ممکن ہے اس کے بعد بھی کچھ خط لکھے گئے ہوں اور وہ ضائع ہو گئے ہوں۔ کیونکہ غالب کا آخری خط جواب طلب ہے اور مولوی نعمان احمد سے یہ بات بعید تھی کہ انہوں نے غالب کے بعض استفسارات کا جواب نہ دیا ہو۔ بہر حال ان چار خطوں کے مطالعہ سے بھی بعض ضروری باتیں معلوم ہوتی ہیں اور ان کا مطالعہ ہر شخص کے ذہن کو ادھر منتقل کر دے گا۔ پہلے خط میں خاکساری اور تعلّی کا وہ ملا جلا انداز موجود ہے جو غالب کا خاصہ تھا اور ساتھ ہی ساتھ مولوی نعمان احمد کے اندازِ تحریر کی تعریف بھی کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولوی نعمان احمد نے اپنے

پہلے خط میں کوئی سوال پوچھنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ غالب اس سوال کے سننے کے آرزومند ہیں۔ دوسرے خط کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ غالباً یہ سوال قرآن اور سبع قران سے متعلق ہے، کیونکہ غالب کا دوسرا خط اسی بحث سے بھرا ہوا ہے۔ دوسرے ہی خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے فارسی میں خط لکھنا آخر عمر میں ترک کر دیا تھا اور محض شاہزادہ بشیرالدین کو فارسی میں خط لکھتے تھے۔

تیسرے خط میں صرف چند کتابیں بھیجنے کا ذکر ہے۔ البتہ ایک بات یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ مولوی نعمان احمد غالب کی طرح خطوں کے جواب لکھنے میں عجلت نہیں کرتے تھے، کیونکہ ابھی انہوں نے غالب کے ۱۴ اکتوبر والے خط کا جواب نہیں دیا تھا کہ غالب نے ۱۸-۱۹ اکتوبر کو کتابوں کا پارسل بھیجنے کے متعلق پھر خط لکھا اور اپنے پچھلے خط کا جواب نہ آنے کا تذکرہ بھی اسی خط میں کر دیا۔ چوتھے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے تیسرے خط کا جواب آیا۔ اس کے بعد مولوی نعمان احمد اکبرآباد چلے گئے۔ اس لیے غالب نے کچھ دن انتظار کر کے پھر خط لکھا۔ معلوم نہیں اکبرآباد میں کونسا ہنگامہ تھا؟ ممکن ہے کوئی دربار وغیرہ ہو رہا ہو، جس میں تعلقداروں کو شریک ہونا پڑا ہو، بہرحال اس کے بعد یہ کڑی ٹوٹ جاتی ہے۔ غالب اس خط کے بعد تقریباً دو سال دو مہینہ تک زندہ رہے مگر انہوں نے اپنے کسی دوسرے مکتوب الیہ کے خط میں مولوی نعمان احمد سے اپنی خط و کتابت کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ اس سے بھی خیال ہوتا ہے کہ یہ تعلق وقتی طور پر قائم ہوا اور پھر ختم ہو گیا۔

مجھے یہ خط مولوی عمران احمد ابن مولوی نعمان احمد کے پوتے وقار احمد سے ملے انہیں باریک کپڑوں میں معہ لفافوں کے بڑی احتیاط سے چسپاں کر دیا گیا تھا۔ کہیں کہیں روشنائی اڑ گئی تھی مگر ہر لفظ پڑھا جا سکتا تھا۔ یہاں تک کہ ڈاکخانہ کی بعض مہریں بھی صاف پڑھی جا سکتی تھیں۔ مثال کے طور پر تیسرے خط کی مہروں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط ۱۹ اکتوبر کو ڈاک میں ڈالا گیا اور ۱۹ ہی کو دہلی کی مہر لگی۔ ۲۰ اکتوبر کی دو مہریں ہیں، بڑی مہر پڑھی جاتی ہے۔ اس میں لکھا ہے TRAVELLING POST OFFICE N.W.P. اس کے بعد کانپور اور لکھنؤ کی مہریں ہیں، اور دونوں میں ۲۲ اکتوبر ہے۔ ۲۳ اکتوبر کی مہر سیتاپور کی ہے۔ بعض جگہوں

کے نام بھی اُس وقت دوسری طرح سے لکھے جاتے تھے۔ مثلاً دہلی کو انگریزی میں DEHLIE لکھتے تھے اور سیتاپور کو SEETAPOOR

ان خطوں کے مطالب سے بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جن کتابوں کے نام آتے ہیں اور جن مسائل کا ذکر ہے ان میں سے اکثر سے غالب کا مطالعہ کرنے والے واقف ہیں۔ گویہ خط اُس وقت لکھے گئے ہیں جب غالب کے ہاتھ میں رعشہ تھا لیکن تحریر کی شان میں فرق نہیں آیا ہے اور واضح طور پر رعشہ کا پتہ نہیں چلتا ہے۔ ایک آدھ جگہ عبارت گنجلک ہے۔ مثلاً دوسرے خط میں قرآن کی بحث ہے۔ دوسرے تیسرے جملے بہت واضح نہیں ہیں۔ چوتھے خط میں مولوی نعمان احمد کے بیٹے کی نوید صحت کا ذکر ہے۔ اصل خط میں نام پڑھا نہیں جاتا۔ حکیم سید احمد صاحب نے فرمایا کہ سلمان احمد ہے۔ جو مولوی نعمان احمد کے سب سے بڑے بیٹے اور حکیم صاحب کے سب سے بڑے بھائی تھے۔

مجھے یقین ہے کہ یہ خط غالب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوں گے، اور جو لوگ غالب کا تحقیقی مطالعہ کر رہے ہیں، انہیں ان خطوں میں کام کی باتیں ملیں گی۔ اب اصل خط ملاحظہ ہوں۔ میں نے اصل املا میں نقل کرنے کی کوشش کی ہے۔ قوسین میں اکثر الفاظ موجودہ املا میں لکھ دیتے ہیں:

خطوط غالب بہ نام مولوی نعمان احمد

(پہلا خط)

جاں بر سر مکتوب تو از ذوق فشاندن
از عہدۂ تحریر جوابم بدر آورد

ابر رحمت سلامت یادآوری کا شکر بجا لاتا ہوں کیوں میری اتنی تعریف کی (کی)، جو میں اپنی (اپنے) کو اوسکی (اس کے) لائق نہیں پاتا ہوں۔ ہرگز میں ایسا نہیں کہ خدا نی (نے) مجھسے پہلے کوئے (کوئی) ایسا نہ پیدا کیا ہو۔ عنایت مافی الباب یہ ہے کہ سخنوران گزشتہ کا طرز شناس اور ان نازک خیالوں کا پیرو ہوں اور مبداء فیاض سے مجھکو (مجھ کو) اونکی (ان کی) تقلید میں پایہ تحقیق ملا ہے۔ اور میں صاحب طرز جدید ہوں۔ اب یہاں

ایک بات میں سچ کہتا ہوں، آپ باور کریں۔ واللہ میرے ایجاد کیے ہوئے طرز میں آپ سے بہتر نثر کسے (کسی) نے نہیں لکھی۔ نہ یہ مبالغہ ہے نہ تعلی۔ خالصاً للہ آپ سچ ارشاد کریں کہ بعض اشخاص جو اس روش پہ چلتے ہیں باآں کہ خوش رفتار نہیں لیکن مجکو (مجھ کو) برا جانتی (جانتے) ہیں اور برا کہتی (کہتے) ہیں۔ یہ حق ناشناسے (ناشناسی) اور ناانصافی ہے یا نہیں ۔۔۔ اس کا جواب ضرور لکھتی (لکھیے)۔

جو قاطع برہان میں کہیں کہیں سہو طبعی واقع تھا ناچار اوسکے (اس کی) ترمیم و تکمیل کے واسطے اوسے (اسی) نسخہ میں کچھ بڑھایا اور ایک دیباچہ اور لکھا اور اوس (اس) رسالہ کا درفش کاویانی نام رکھا۔ کل یک شنبہ ہے، پارسل ڈاک میں روانہ نہیں ہو سکتا، پرسوں دوشنبہ کو بھیجوں گا۔ اسکی (اس کے) سعادہ پرسش جس کا خط میں وعدہ ہے، اوسکا (اس کا) منتظر اور جلدی پہنچنی (پہنچنے) کا آرزومند ہوں۔ ابکی خط کے عنوان پر جو خیال میں آتے گا وہ لکھونگا اور معذور رہوں گا۔ آئندہ خانے (خانی) نوابے (نوابی) یا جو اور الفاظ اسم مبارک کے ساتھ معمول ہوں اونپر اطلاع پاؤں۔

اسداللہ پانچ شنبہ ۵ ستمبر ۱۸۶۶ء

لفافہ پر پتہ یہ ہے:

مقام سہیوا پرگنہ مہولے ضلع سیتاپور پہنچکر حضرت رفعت مخدوم و مکرم و معظم جناب نعمان احمد صاحب تعلقدار زاد مجدہ کے خدمت میں مقبول ہو۔ پیڈ ضروری۔ ۵ ستمبر ۱۸۶۶ء جواب کا طالب غالب۔

(دوسرا خط)

مولینا و باالفضل اولینا فقیر میں جہاں اور عیب ہیں، ایک یہ بھی عیب ہے کہ جھوٹ نہیں بولتا۔ حکام سے بسبب ریاست خاندانے (خاندانی) کے علاقی کی (علاقے کے) اکثر ملاقات رہتی ہے اور معاملات بھی آپڑتے ہیں۔ خوشامد کیسے (کسی کی) نہیں کے (کی)، بھلا حضرت سے جھوٹ کیوں بولتا اور آپ کی خوشامد کیوں کرتا؟ ایسا عاصے (عاصی) بھی نہیں کہ واللہ باللہ کو تکیہ کلام جانتا ہوں۔ موحدہ کو اور واو کو

قسمیہ جب انکر از روئے قسم لکھا تھا، اوراب بھی از روئے قسم کہتا ہوں کہ نثر کے اس شیوۂ خاصمیں اور مدعیوں سے آپ بہتر ہیں۔ آپکو اپنا ہمفن اور اپنا ہمزبان سمجھ کر اپنا درد دل آپکی (آپ کے) سامنی (سامنے) کہا تھا۔ آپ نے غمخواری نکی (غمخواری نہ کی) بلکہ اور اولٹا آپ مجھسے ملول ہوئے۔ خیر یہ بھی میرے بخت کے (کی) برگشتگی تھے (تھی) کہ حضرت کی (کے) ذہن نے میرے خلاف مقصود کے (کی) جہت انتقال کیا۔ برسوں سے خطوط فارسی میں لکھنی چھوڑدی (لکھنے چھوڑ دیئے) — اب شاہزادہ بشیرالدین بہادر نبیرہ ٹیپو سلطان مغفور کے سوا کسیکو فارسی خط نہیں لکھتا اور یہ موافق ان کے حکم کے ہے۔ اور وہ مطاع ہیں اور میں مطیع بہتر برسکے (برس کی) عمر حواس مسلوب، قویٰ مضمحل بصارت میں ضعف، ہات میں رعشہ، نسیاں مستولی، لیے لو آپ کا خط، آیا، پڑھا جواب اور وقت پر حوالہ کرکے خط مع سرنامہ رکھ چھوڑا، آج جو جواب لکھنی (لکھنے) بیٹھا خط نہیں ملتا نہ بکس میں نہ کتابوں میں، نہ طاق میں۔ حیران کہ اب کیا کروں؟ بارے جو کچھ یاد آگیا اوسکا جواب لکھا۔ قرآن کے باب میں عرض یہ ہے کہ زہرہ و مشتری کا ایک برج اور درجہ و دقیقہ میں برابر ہونا قرآن السعدین ہے۔ اور یہ قرآنات جزئیہ میں سے ہے اور اکثر واقع ہوتا ہی (ہے) اور یہ قران جب سلطنت موعود نہیں اگر کسی بادشاہ کے ہنگام ولادت یہ قران آپڑا ہوگا بشرطِ آنکہ برج طالع میں یا اوتاد مثلثہ یا مائل اوتاد میں واقع ہو کہ نظرا وسکے (اس کی) طالع موعود پر ہو تو وہ افادۂ صحت و عیش و عشرت کرتا ہی (ہے) اور بس۔ وہ قرانات اور ہیں جو موجب تغیر اوضاع عالم و انتقال سلطنت ہوتے ہیں۔ ازاں جملہ ایک یہ قران تھا کہ زحل و مریخ سرطان میں فراہم ہوتے تھی (تھے) سراسر ہندستان کے (ہندوستان کی) خاک اوڑا دے (اڑادی) قصہ مختصر جو بادشاہ صاحبقران کہلاتا ہی (ہے)، طالع ولادتمیں قران السعدین واقع ہونا ضرور نہیں۔ صاحبقراں مرادف شاہنشاہ ہی (ہے) سو بھی صرف سلاطین تمریہ میں دو شخص صاحبقران کہلاتے ہیں۔ امیر تمر اور شاہجہاں۔ تتبع کلام اساتذہ سے معلوم ہوگا کہ خاقانی (خاقانی) نے اپنی (اپنے) کو صاحبقراں لکھا ہی (ہے)۔ اسطرح فقیر نے بھی لکھا ہے۔

سزد "گر نویسند صاحبقرانم" اور بیان مدت توقیع نویسے (نویسی) علت

نہیں ہے۔ صاحبقران کہلانیکے (کہلانے کی) فقط۔

اسداللہ غالب۔ ۱۲۸۷ھ شنبہ ششم اکتوبر ۱۸۶۶ء

از روئے احتیاط بیرنگ بھیجتا ہوں

لفافہ پر پتہ یہ ہے:

مہیوا پرگنہ مہولی ضلع سیتاپور ۶ اکتوبر ۶۶ بیرنگ ضروری۔ جواب طلب
بخدمت مخدوم ومکرم مولوی نعمان احمد صاحب زاد مجدہٗ مقبول باد۔

از اسد

(تیسرا خط)

حضرت آپ کو اپنے حال پر متوجہ پاکر اور مایل تحقیق جانکر کل چار سواد میں نے بسبیل پارسل روانہ کئی (کئے) ہیں ایک دافع ہذیان مصنف اسکے مولوی نجف علی مجمع البحرین علم فارسی و عربی سبب تالیف یہ کہ ایک شخص عامی فضول نے اپنی شہر تکے واسطے قاطع برہان کے مطالب کے رد میں ایک کتاب لکھے (لکھی) محرق قاطع برہان اوسکا نام رکھا، عبارت مہمل مقاصد پوچ مولوی نجف علی نے منصفانہ اوسکے رد میں ایک رسالہ لکھا موسوم بہ دافع ہذیان فارسی قدیم کے طرز پر دوسرا رسالہ سوالات عبدالکریم یہ شخص طالب علم ساکن دہلی اس نسخے کے خاتمے پر استفتاہی (ہے) جسکو میں نے تیسرا سواد شمار کیا ہی (ہے) چوتھا لطائف غیبی یہ رسالہ زبان اردو میں ہے۔ اسکا حال اسکے مشاہدہ سے کھلیگا۔ متوقع ہوں کہ اس پارسل کے (کی) رسید ضرور لکھیے گا اور پارسل سے کئی دن پہلے ایک خط بھیجا ہے۔ اوسکے جواب کا بھی طلب گار ہوں

اسداللہ بیدستگاہ ۱۹ اکتوبر ۱۸۶۶ء

نظر بہ احتیاط یہ خط بیرنگ بھیجا ہے قصور معاف۔

لفافہ پہ پتہ یہ ہے:

ضلع سیتاپور تعلقہ مہیوا پرگنہ مہولے بخدمت جناب مولوی نعمان احمد صاحب زاد مجدہ مقبول باد از اسد یکہ نگ بیرنگ ۱۸ ماہ

اکتوبر ۱۸۶۶ء۔
ضروری جواب طلب۔

(چوتھا خط)

قبلہ آج خیال آیا کہ نامہ مرقومہ ۳۱ اکتوبر کے بعد کوئی خط میرے حضرت کا نہیں آیا۔ اوسمیں میرے بھیجے ہوتے (میری بھیجی ہوئی) کتابوں کی رسید اور آپ کا عازم اکبر آباد ہونا مندرج تھا۔ اکبر آباد کا ہنگامہ تمام ہوا۔ غالب ہے کہ آپ بھی اپنی دارالریاست کو پہونچ گئے ہونگی (گئے ہوں گے) عجب ہے کہ وہاں پہونچکر بھی آپ نے یاد نہ کیا۔ للہٰ الحمد کہ اقبال نشان عالیہ دودمان مولوی (مسلمان) احمد خاں کے (کی) نوید صحت از روئے مکتوب معلوم ہو گئی ہی (ہے) فقیر کے (کی) دعاے بے ریا اونکو پہونچے ..... میں حسب الحکم خط بیرنگ بھیجتا ہوں مگر طریق احوط یہ ہے کہ آپ کی (آپ کے) خطوط بھی بیرنگ روانہ ہوا کریں کہ فی الجملہ اسمیں تلف ہونیکا اندیشہ کم ہی (ہے) جانتا ہوں کہ آپ شعر کہتی (کہتے) ہوں گے اگر میرا گمان سچ ہی (ہے) تو جیسا کہ نثر سے متمتع ہوا ہوں نظم سے بھی بہرہ اندوز ہوں۔

نامہ غالب بے ادب تقصیر معاف جواب طلب
دوشنبہ ۱۷ دسمبر ۱۸۶۶ء

لفافہ پر پتہ یہ ہے:
ضلع سیتاپور پرگنہ مہولی مقام مہیوا بوالا خدمت مولویصاحب جمیل المناقب عمیم الاحسان مولوی نعمان احمد خاں بہادر تعلقہ دار زاد مجدہٗ مقبول باد۔

اسد بکرنگ بیرنگ۔ ۱۷ دسمبر ۱۸۶۶ء

ظ۔انصاری

ابرِ گہربار

غالب کی شعری زندگی کا بہترین کارنامہ

مولانا حالی نے 'یادگار غالب' میں ابرِ گہربار کی بڑی تعریف کی ہے لیکن اسے آخری عمر کی تصنیف قرار دیا ہے۔ حالانکہ یہ مثنوی ۱۸۵۰ء کے قریب اتنی ہی تھی جتنی غالب کے بعد شائع ہوئی۔ سرسید نے "آثار الصنادید" میں غالب کا بڑے طمطراق سے ذکر کیا ہے لیکن انتخاب ان کا بہت کمزور ہے۔ وہ شعر جن سے غالب کی شعری عظمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، سرسید سے انتخاب نہ ہوتے۔ تاہم ابرِ گہربار کا ذکر انہوں نے ایسے لفظوں میں کیا ہے۔ گویا غالب کی اس مثنوی کا چرچا اسی زمانے میں ہونے لگا تھا اور اسی کے ساتھ یہ بھی کہ مثنوی ابھی ناتمام ہے۔ (یہ ۱۸۴۷ کا ذکر ہے)

حالی نے اس کے ۸۲۰ شعر گنائے ہیں۔ شاید انہوں نے شمار کرنے کی زحمت نہیں اٹھائی۔ اندازے سے لکھ دیا۔ نیاز فتحپوری نے نگار کے غالب نمبر میں ساڑھے چھ سو شعر بتاتے ہیں۔ غالباً انہوں نے حالی کا بیان کافی سمجھا۔ حالی اور نیاز دونوں نے "ابر گہربار" کے جو گہر چنے ہیں ان میں بھی افتادِ طبع کا بہت دخل ہے۔

غالب کے بیان کے مطابق، جو ان کے فارسی نثر پارے میں ہمیں ملتا ہے، رسول اللہ کے غزوات نظم کرنے کا ارادہ تھا۔ فردوسی کے شاہنامے کی بحر اور اسی کے طرز پر مثنوی میں بھی۔ فردوسی پر اسی پہلو سے طنز کیا ہے کہ ساسانی بادشاہوں کی فرضی داستانیں نظم کرنا اور کام ہے اور دین کے بادشاہ کی عظمت کی مدح سرائی کرنا اور بات ہے۔ وہ کام جیسا بھی ہو بہر حال غالب اس راہ پر بہت دور نہ جا سکے۔ حمد لکھی تو خدا سے جھگڑنے لگے، نعت لکھی تو ساقی اور مغنی یاد آیا۔ نیت بخیر تھی اس لیے غالب کو خدا رسول کے واسطے سے دل کی بھڑاس نکالنی تھی ایک ہزار اٹھانوے (۱۰۹۸) شعر

میں نکال لی۔ غالب اگر خود نہ بتاتے کہ یہ مثنوی ناتمام ہے تو اس میں ناتمامی کا کوئی نشان نہ ملتا۔

یہ مثنوی نہیں آدمی کا شاہ نامہ ہے اور ایسا بلند بانگ پر جوش اور فکر و نظر سے معمور کہ اگر "ابر گہر بار" نہ لکھی جاتی تو اقبال کا شکوہ نہ ہوتا، جوش کی مردانہ شاعری کو لہجہ نہ ملتا، ابو الکلام کی نثر سینے کے بل رینگتی۔ اور اگر غالب نے اس مثنوی کے سوا کچھ اور نہ لکھا ہوتا تب بھی اس کے شاعرانہ قد کا آج ہم اندازہ کر سکتے تھے۔ اس میں ہمارے عہد کی جھلک ہی ہے۔

ابر گہر بار زمانے کے دستور کے مطابق شکر خدا سے شروع ہوتی ہے لیکن اس میں غالب کا اپنا الگ انداز ہے۔

سپاسے کزو نامہ نامی شود
سخن در گذارش گرامی شود

سپاسے کہ آغاز گفتار زوست
سخن چوں خط از رخ نمودار زوست

سپاسے کہ تالب ازو کام یافت
رواں ہا بداں رامش آرام یافت

سپاس دوئی سوز کثرت ربا
سپاسے دل افروز بینش فزا

ان اشعار میں خدا کے بجائے خدا کے ایسے شکر کا ذکر ہے جس کے ادا کرنے سے تحریر کی آبرو بڑھ جاتی ہے۔ بات عرض کرنے میں باوقار ہو جاتی ہے۔ یہیں سے گفتگو کی شروعات ہے اور جس طرح چہرہ داڑھی نکلنے سے نمودار ہوتا ہے، ہر ایک بیان اس شکر کے الفاظ نکلنے سے ایک حیثیت پاتا ہے جب اس شکر کا لفظ لب پر آجاتا ہے تو نغمے سے روح کو راحت میسر ہوتی ہے۔ یہ شکر وہ شے ہے کہ جس سے ایکانت ملے، دوئی جل کر خاک ہو (عالم میں مناظر کی) اکثرت کا نقش آنکھوں سے ہٹ جائے، دل کو نور اور بینائی کو بصیرت یا گہرائی نصیب ہو۔

شکر کے ساتھ ہی کثرت میں وحدت کا تماشا اور انسانی غور و فکر کی روشنی کا ذکر زبان پر آگیا۔

خدارا سزد کز درون پروری
بدیں شیوہ بخشد شناساوری

یہ سب شکر اس خدا کو زیب دیتے ہیں جو روح کو جلا بخشنے کی بدولت اس انداز سے انسان کو گیان عطا کرتا ہے۔

خرد جنس ہستی فروشندگاں
دہد مزد بے ہودہ کوشندگاں

رباید دل اما ز دل دادگاں
کشد ناز لیکن ز افتادگاں

زبادے کہ بر دل وزد در نہفت
زباں را بہ پیدا در آرد بگفت

وہ ایسا ہے کہ جو لوگ اپنے وجود کی بازی لگا دیتے ہیں ان کا خریدار ہے اور جو فضول کی محنت کرتے ہیں ان کو بھی محنت کا صلہ عطا کرتا ہے۔ دل انہیں کا لیتا ہے جو دینے پر تلے ہوں، ناز انہیں کے اٹھاتا ہے جن کی بے بسی یا عاجزی اوروں سے ناز اٹھوانے کے قابل نہ ہو۔ وہ جھونکے جو اندر ہی اندر دل پر سے گزر جاتے ہیں کھلے عام زبان کو قوت گویائی بخش دیتے ہیں۔

پھر کیا خوب کہا ہے:

دل و دست با ہم دگر دوختہ
دریں کیسہ کردار اندوختہ

رواں و خرد باہم آمیختہ
ازیں پردہ گفتار انگیختہ

نہ زیں شو گہر ہا شمردن تواں
نہ رہ اندریں پردہ بردن تواں

بہ نیروئے نہ چرخ برہم زدن
نشاید ز دانستہ او دم زدن

انسان کے دل (دماغ) اور اس کے ہاتھ کو اس طرح سی دیا ہے کہ اس تھیلی کی سلائی

میں کردار سمیٹ کے رکھ دیا ہے۔ روح اور عقل کا جوڑ کچھ اس طرح بٹھایا ہے کہ اسی پردہ ساز سے کلام کا نغمہ اٹھتا ہے، نہ آدمی پردے کے اس طرف سے موتیوں کو گن سکتا ہے اور نہ اس پردے کے اندر راہ پا سکتا ہے۔

پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

وہ طاقت جو سارے آسمانوں کو تلپٹ کر کے رکھ دے اتنی سکت نہیں رکھتی کہ عرفان کا یا "اس" کے بارے میں پورے گیان کا دم بھر سکے۔

نہ بیند جز ایں ہیچ بینندۂ — کہ مارا بود آفرینندۂ
کہ اندازۂ آفرینش بدوست — دم دانش و دادِ بینش بدوست
جہاں داور دانش آموزگار — بہ خور روشنائی دہ روزگار
نگارندۂ پیکر آب و گل — شمارندۂ گوہر جان و دل
رواں را بہ دانست سرمایہ ساز — زباں را بگفتار پیرایہ ساز
بہ دانش بہ اندیشہ فرزانگاں — بمستی نگہدار دیوانگاں

عقل انسانی یوں تو دور کی کوڑی لاتی ہے لیکن خدا تک پہنچنے میں اس کے بھی پر جلتے ہیں۔ کسی صاحب نظر کی نگاہ اس سے آگے نہیں جاتی کہ ہمیں کسی نہ کسی نے پیدا کیا۔ مٹی پانی کی یہ مورتی نقش کر کے رکھ دی۔ جان و دل کے اصلی جوہر کا شمار کرنے والا وہی ہے۔ سوجھ بوجھ دے کر روح کو مالا مال کیا اور زبان کو کلام کا زیور بخشا۔ جن کے دماغوں میں روشنی ہے، قدرت نے علم و دانش دے کر ان کے بھلے کی سوچی اور جن دیوانوں کو اپنے قول و عمل پر اختیار نہیں، انہیں مستی دے کر بہلا دیا۔ (ایک مفہوم یہ نکلتا ہے کہ عقل کی گمرہی میں مبتلا نہ ہو اور دیوانے مستی میں آپے سے باہر نہ ہو جائیں۔ دونوں کا پورا خیال رکھا ہے۔)

بارہ اشعار کے تسلسل کے بعد کائنات خدا اور خدا پرستوں کے ظاہرا اختلاف کو یوں ایک رشتے میں پرو دیا ہے۔

زہے ہستی محض و عین وجود — کہ نازد بہ یکتائیش ہست و بود
زشاخا بہ کز قلزمے سر دہد — بہر تشنہ آشام دیگر دہد
بہ یک بادہ بخشد ز پیمانہ — بہر ذرہ رقص جداگانہ

گرد ہے ز مستی بہ غوغا دروں ہنوزش ہماں مے بہ مینا دروں

اس ہستی مطلق کا کیا کہنا، وہ واجب الوجود ہے، جو کچھ ہے، جو کچھ تھا، یعنی سارا عالم اسی کی یکتائی پر ناز کرتا ہے۔ جو نہر قلزم سے کاٹ کر نکالی گئی اس نہر سے ہر ایک پیاسے کی پیاس الگ الگ بجھا دیتا ہے۔ اصل نور سے ہر ایک کو علاحدہ جلوہ میسر ہے۔ شراب وہی ہے ہر ایک کا پیمانہ اور ہے۔ ہر ایک ذرہ جداگانہ رقص کرتا ہے، کوئی کیسے کوئی کیسے۔ ایک گروہ ہے کہ عالم مستی میں شور مچاتے جاتا ہے۔ لیکن دیکھو تو وہی مے اس کی بوتل میں بھی ہے۔

اور پھر چھ شعر بعد:

مناجاتیاں پیش وے در نماز خراباتیاں را بدو چشم باز
اگر کافرانند ز نہاریش دگر مومناں در پرستاریش
ہو الحق سرایان اوعیب جو اناالحق نوایان او تلخ گو
نہ تنہا خوشی ناز پروردِ اوست کہ غم نیز دل را رہ آوردِ اوست

نماز پڑھنے والے اس کے آگے سربسجدہ ہیں اور جنہیں اپنے تن بدن کا ہوش نہیں وہ بھی اسی کی طرف آنکھیں کھلی رکھتے ہیں۔ اگر "کافر" ہیں تو وہ اسی کی پناہ چاہتے ہیں۔ مومن ہیں تو اسی کی عبادت میں لگے ہیں۔ جنہوں نے یہ کہا کہ بس وہی حق (یا اوم تت ست) ہے۔ ان کی آواز عالم غیب کو چھو گئی اور جنہوں نے کہا کہ میں حق ہوں (اول و آخر وجود کو اپنے اندر پایا) وہ کڑوی سچائی بیان کرتے ہیں۔ محض خوشی ہی اس کی چہیتی نہیں ہے بلکہ غم کو بھی دل میں اسی نے ڈالا ہے۔

بہر لب کہ جوئی نواتے از اوست بہر سر کہ بینی ہواتے از اوست
اگر دیو سار یست بے ہوش و ہنگ کہ ہموارہ پیکر تراشد ز سنگ
بہ بت سجدہ زاں روا داشتہ کہ بت را خداوند پنداشتہ
دگر خیرہ چشمے ست نیر پرست بہ دردے از جام اندیشہ مست
بہرش ازاں راہ جنبیدہ مہر کزیں روزنش دوست بنمودہ چہر
زناری درونان اہریمنے گرد ہے بود گز خرد دشمنے

زبس داد ناآشنائی دہند | باتش نشان خدائی دہند
به تن ہا بر آذر گرایش کناں | بدل ہا خدا را نیایش کناں
گروہے سراسیمہ در دشت و کو | خداوند جو و خداوند گو
زرہمے کہ خود را براں بستہ اند | بہ یزداں پرستی میاں بستہ اند
زمہرے کہ بے خواست در دل بود | پرستند حق گر بہ باطل بود
نظر گاہ جمع پریشاں یکیست | پرستند انبوہ و یزداں یکیست

جس لب کو دیکھو گے اسی ایک کی آواز بلند پاؤ گے۔ ہر ایک سر میں اسی کا سودا سمایا ہے۔ کوئی گمراہ ہو، عقل و ہوش سے عاری رہے، پتھر کے بت تراشا کرے لیکن اس بت کے آگے سر جھکاتا ہے تو محض اسی کارن کہ "پتھر کی مورتی کو سمجھا ہے وہ خدا ہے"۔ کوئی بے شرمی سے سورج ہی کی پوجا کیے جاتا ہے۔ فکر و نظر کے جام میں اس کا حصہ تلچھٹ رہا لیکن اسی ایک چلو میں مست ہو گیا۔ اسی نے سوریہ پوجا کی راہ یوں اختیار کی کہ اس جھروکے سے بھی وہی محبوب اپنے درشن دیتا ہے۔ سیاہ باطن لوگوں میں سے ایک گروہ ایسا بھی ہے جو عقل کے پیچھے لٹھ لیے دوڑتے ہیں۔ انہوں نے ناسمجھی کی حد کر دی، آگ میں خدا کو کھوج نکال لیا۔ ان کو دیکھو تو صرف بدن ہی بدن اگنی پوجا کرتے دکھائی دیں گے، ورنہ اصل میں وہ دل سے خدا کے ہی گن گان کرتے ہیں۔ ایک اور گروہ ہے جو گیوں سنیاسیوں کا کہ جنگل اور پہاڑ چھانتا پھرتا ہے۔ اسے بھی ایشور (مالک) کی تلاش ہے، اور اسی کا نام زبان پر ہے۔ ریت روپ کوئی بھی ہو لیکن عبادت خدا کی ہی کرتے ہیں۔ ان کے دلوں میں آپ سے آپ محبت بھری ہے۔ غلط طریقوں سے سہی لیکن حق یا ستیہ کی پرستش کی جا رہی ہے۔ بکھرے ہوتے لوگوں کی اس بھیڑ میں سب کی نگاہ کا مرکز ایک ہی ہے۔ ہر طرح کے لوگ اپنے اپنے طور پر سر جھکاتے ہیں جس کے آگے جھکاتے ہیں وہ ایک ہے۔

جہاں چیست آئینۂ آگہی | فضائے نظر گاہ وجہ اللّٰہی
بہر سو کہ رو آوری سوئے اوست | خود آں رو کہ آوردہ روئی اوست

یہ دنیا کیا ہے آگاہی، علم و خبر کا ایک آیئنہ ہے۔ ایک ایسی فضا پھیلی ہے جس میں نظر ٹھہرتی ہے تو سامنے خدا کی صورت دیکھتی ہے۔ جدھر بھی منہ موڑو گے اسی کی طرف رخ ہو گا اور وہ منہ جو تم پھیرتے ہو وہ خود کیا ہے۔ وہ بھی تو اسی کا منہ ہے۔

"مناجات" کے عنوان سے اب مثنوی کا وہ حصہ شروع ہوتا ہے، جس کا ہندستان کے فارسی گویوں کے ہاں جواب نہیں ملتا۔

خدایا زبانے کہ بخشیدۂ
بہ نیروتے جانے کہ بخشیدۂ

دمادم بجنبش گر آید ہمی
زراز تو حرفے بسر آید ہمی

نہ دانم کہ پیوند حرف از کجاست
دریں پردہ لحنے شگرف از کجاست

گر از دل شناسم جنوں بیش نیست
کہ آں نیز یک قطرہ خوں بیش نیست

خرد را سگالم کہ نیرو دہد
خود اورا زمن حیرتے رو دہد

اے خدا یہ جو زبان تو نے مجھے بخشی ہے اور یہ روح کی قوت جو تجھ سے ہم کو عطا ہوتی ہے اس کا خاصہ یہ ہے کہ لحظہ بہ لحظہ حرکت میں آتی ہے تو تیرے ہی راز ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ نہ جانے حرف و لفظ کا رشتہ کہاں سے ہے اور اس پردے میں جو نفیس نغمہ سر ہوتا ہے وہ کہاں سے آیا۔ اگر یہ سوچوں کہ دل کی بدولت، تو اس میں دیوانگی کے سوا دھرا کیا ہے اور دل کی حقیقت ہی کیا "اک قطرہ خوں وہ بھی"۔ عقل سے صلاح کرتا ہوں، کیونکہ وہی طاقت دیتی ہے۔ مگر جب یہ سوال کیا جاتے تو خود حیرت میں پڑ جاتی ہے۔

پھر شاعر سوال کرتا ہے کہ اتنے پردے اپنی حقیقت پر ڈال رکھے ہیں اور ہر پردے میں چھری کھلی رکھی ہے۔ اسی پردے نے آدمی کو ہراس و امید کی دورنگی

میں چھوڑ دیا ہے۔ کفر اور دین، شک اور یقین اور زندگی کے تضادوں اور نیرنگیوں سے:

عیار وجود آشکارا کنی
نشاں ہائے جود آشکارا کنی

عالم وجود کو پھیلا رکھا ہے تاکہ اس کے روپ میں تجھے دیکھا جائے اور اس طرح اپنی فیاضی کے نشان دکھا دیتے ہیں۔

کنی ساز ہنگامہ اندر ضمیر
چونم دریم ورشتہ اندر حریر
ظہور صفات تو جز در تو نیست
نشاں ہائے ذات تو جز در تو نیست

زہر پردہ پیدا نوا سازیے
بہر جلوہ پنہاں نظر بازیے
زہر پردہ رنگے کہ گیرد کشاد
چناں دلکش افتد کہ بے آں مباد

اپنی صفات کے اظہار میں تو نے وہ رنگا رنگی دکھائی ہے کہ ہر ایک شے کے ضمیر میں ہنگامے کا سامان سمو دیا ہے۔ جیسے دریا میں تری، جیسے ریشم میں باریک تار، غور کرو تو تیری صفات کا یہ جو ظہور نظر آتا ہے اس کی حقیقت کچھ نہیں، اور تیری ذات کے جو نشان پھیلے ہیں وہ بھی برائے نام ہیں ورنہ سب کی اصلیت تجھی میں پنہاں ہے۔ (یہاں پھر "اعیان ثابتہ" کے نظریے کی تائید نکلتی ہے) ہر ایک پردے سے تیری نوا سازی جھلکتی ہے۔ ہر جلوے میں تو خود اپنا جلوہ دیکھ رہا ہے۔ مزے کی بات یہ کہ ہر ایک پردے سے جو رنگ بھی جھلکتا ہے وہ کچھ ایسا بر محل اور دلکش ہے کہ وہ وہاں نہ ہو تو خرابی پڑ جائے۔ دل کہتا ہے کہ اس کے بغیر نہ رہنے پائے۔ مثلاً:

باآہن کلید و بہ زر نام شاہ   بمستاں نشید و بعشاق آہ

به ابر از پئے خاک، آب حیات — به خاک از نم ابر، جوشش نبات
به مے در فروغے که چوں بردمد — ز سیماۓ میخواره نیز دمد
به نے در نواۓ که چوں برکشند — بآواز آں، نالہ ساغر کشند
به ساقی خرامے که از دلبری — ز شاہد برد دل به ساقی گری
به شاہد ادائے که از سر خوشی — به ساقی دہد داروۓ بے ہشی
به آزاده دستے که ساغر زند — به افتاده سنگے که بر سر زند

مستوں کو الاپ دی، عاشقوں کو آہ، آہنی تالے کو چابی اور سکّے کو بادشاہ کا نام، بادل کو آب حیات دیا کہ پیاسی دھرتی کو سیراب کرے۔ مٹی کو اس پانی سے یہ قوت دی کہ نباتات بھبک اٹھیں۔ شراب کو وہ روشنی دی کہ جب وہ دمکنے پر آتی ہے تو پینے والے کے ماتھے پر ستارے جگمگا اٹھتے ہیں۔ بنسری کے گلے میں وہ رس ڈال دیا ہے کہ جب وہ لہراتی ہے تو لوگ لہرا کر پی جاتے ہیں۔ ساقی کو وہ اندازِ رفتار دیا ہے کہ اوروں کا کیا ذکر خود دلربا اس پر لٹو ہو جاتے ہیں اور پھر حسینوں کو وہ ادا دی ہے کہ ساقی دیکھتے ہی ہوش کھو بیٹھتا ہے۔ آزاد مردوں کو وہ ہاتھ دیتے ہیں جو ساغر شِکَن دیتے ہیں اور پٹکے ہوئے لوگوں کو وہ پتھر دیا ہے جسے وہ اپنے سر پہ مار لیتے ہیں۔

ہر ایک پردے کو اس کے مناسب حال رنگ ملا تو غالب کو کیا ملا۔

ز ہر شیوہ ناسازگاری رسد
ز ہر گوشہ صد گونہ خواری رسد

به بزم ار چہ در خوردن بادہ ایم
ولیکن بداں گوشہ افتادہ ایم

که چوں سوۓ ما ساقی آرد پسیچ
نیابیم جز گردش از جام ہیچ

به کفر آنچناں کردہ کوشش که خویش
نباشیم تارے ز زنار بیش

ہمیں یہ ملا کہ ہر پانسہ الٹا پڑتا ہے اور ہر ایک سمت سے ذلت و بدنامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اگرچہ محفل میں بظاہر لگتا ہے کہ ہم پتے بیٹھے ہیں لیکن وہاں بھی ایسا ایک کونا کھدرا ہمارے حصے میں آیا کہ جب ساقی اس طرف رجوع ہوتا ہے تو جام گھوم پھر کر یوں ہی چلا جاتا ہے۔ گردش کے سوا جام سے بھی کچھ نہیں ملنے پاتا۔ کفر کی حرکتیں ایسی زوروں پہ کی ہیں کہ ہماری حیثیت جنیو کے ایک دھاگے سے زیادہ نہیں رہی۔

نتیجہ یہ کہ ہمارے نامۂ اعمال میں گناہوں کا پشتارہ نکلے گا اور آگ میں جھونکے جائیں گے۔ شرم و گناہ سے جل بجھیں گے۔ لیکن ذرا سوچ تو کہ یہ دین کس کی ہے۔ یہ سب تیرا ہی دیا ہوا ہے۔ باغ پہ جب بادل برستا ہے چمن میں پھول اور دیوار پہ کائی اُگا دیتا ہے۔ دیوار کی کائی بے چاری بدمنظر سہی مگر پتہ یہی دیتی ہے کہ باغ سرسبز و شاداب ہے۔ اسی طرح اگر ہم بے عزت بے فیض ہیں تب بھی تیرے چاہنے والے ہیں۔ تیرے عشق کی آگ میں جلے ہیں، تیرے ہی باغ کی کائی برابر ہیں۔

اگر کاسۂ قیس مسکیں شکست
صدائے زلیلیٰ دراں کاسہ ہست

اگر غریب مجنوں کا گدائی کا پیالہ ٹوٹ گیا ہے تو کاسے کی خواری کے ساتھ یہ بدنامی بھی لگی ہے کہ لیلیٰ کے نام کی صدا اس کاسے میں بسی ہوتی ہے۔

"مناجات" کے تسلسل کو درمیان میں ۵۸ شعر کی ایک حکایت ذرا دیر کے لیے توڑ دیتی ہے۔ ایک فتح مند بادشاہ اپنی راجدھانی کو واپس آرہا ہے، اور اہل شہر نے اس کے استقبال کی دھوم دھام کی ہے۔ شاہی قیدیوں نے جنہیں کالی جھنڈیوں کا مظاہرہ کرنا تھا، شکستہ دلی کے ساتھ آنسوؤں کے موتیوں سے بادشاہ کا استقبال کیا۔ بادشاہ کا دل بھر آیا اور اس نے کہا کہ یہ لوہا اور گودڑ بھی جس میں لپٹے ہوئے "زندانی" آتے ہیں، "خود میرا ہی دیا ہوا ہے"۔ انہوں نے میرے برتاؤ کی حقیقت مجھ پہ آشکار کردی ہے۔

اصل مناجات اب شروع ہوتی ہے۔ یہ نظم کا وہ حصہ ہے جس کا جواب ہندوستان کے فارسی گویوں کے ہاں نہیں ملے گا۔ شکر کے بعد اب شکایت کا دفتر کھلتا ہے۔

اے پروردگار یہاں جو کچھ ہے "تیرا ہی دیا ہوا تو ہے"۔ بہار، خزاں، پھول، تنکا سب تیرے دم قدم سے ہے۔

(مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ)

به روزے که مردم شوند انجمن[1]
شود تازه پیوند جاں ہا بہ تن
رواں را بہ نیکی نوازندگاں
بہ سرمایۂ خویش نازندگاں
گہر ہائے شہوار پیش آورند
فرو ہیدہ کردار پیش آورند

(قیامت کے دن) جب لوگوں کا مجمع لگایا جائے گا اور جسموں میں پھر سے جان ڈالی جائے گی تو وہ لوگ جنھوں نے نیک اعمال کے ڈھیر لگا دیتے ہیں اپنی پیش کش پر ناز کرتے ہوتے ایک سے ایک بڑا موتی لا کر رکھ دیں گے اور اعلا درجے کا نامۂ اعمال سامنے کر دیں گے۔ اسی ہجوم میں یہ گناہ گار بھی سر جھکائے ہوئے حاضر ہوگا۔ جسے زندگی کی دشواریوں نے مار ڈالا ہے یہاں سے مناجات کیا ہے حساب کتاب کا بار اٹھانے والے خدا سے دو بدو گفتگو بن گئی ہے:

بہ بخشائے برناکسی ہائے من تہی دست و درماندہ ام وائے من
بدوش ترازو منہ بار من نہ سنجیدہ بگذار کردار من
بہ کردار سنجے میافزائے رنج گراں باری درد عمرم بہ سنج

ا۔ معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ عبدالحکیم اور ممتاز حسین دونوں نے اس شعر کو اس کے مقام سے علاحدہ کہیں پڑھ لیا ہے اور غچہ کھایا ہے۔ ممتاز حسین اپنے فاضلانہ دیباچے میں ایک جگہ لکھتے ہیں: "میں اس مستقبل کو تو دیکھ پایا تھا جبکہ انسان اپنے تمام تعصبات ذہنی اور ملی کو مٹا کر ایک انجمن میں تبدیل ہو جائے گا۔" حالانکہ یہ شعر روز قیامت کے بارے میں ہے، غیر طبقاتی سماج کے مستقبل کے بارے میں قطعی نہیں۔

اگر دیگراں را بود گفت و کرد مرا مایۂ عمر رنج ست و درد
چہ پرسی چواں رنج و درد از تو بود غمے تازہ در ہر نورد از تو بود

میری نالائقی پر ترس کھا کر یوں ہی بخش دے۔ افسوسناک پوزیشن میں ہوں۔ مفلس ہوں، تھکا ہارا ہوں، ترازو پر میرے اعمال کا بوجھ نہ رکھنے دے۔ تولے بغیر اس سے درگزر کر۔ اگر اعمال تولے گئے تو میرے داغ اور گہرے ہو جائیں گے۔ عمر بھر کی تکلیفوں کا وزن بھی تو دیکھ۔ اوروں کے حساب میں اگر قول و عمل کا وزن ہے تو میری زندگی کے حساب میں رنج و درد کے سوا رکھنے کو کیا ہے۔ اس کا پوچھنا پچھنا کیا ہے۔ یہ سب تیرا ہی تو دیا ہوا تھا۔ ہر لپیٹ میں ایک نیا غم میرا مقدر ہو گیا اور وہ بھی تیرے حکم سے۔

فرو ہل کہ حسرت خمیر من ست
دم سرد من زمہریر من ست

مجھے بے حساب ہی رہنے دے کیونکہ حسرت میری گھٹی میں پڑی ہے اور میری آہ سرد ہی جسم و جان کو تھرتھرانے اور عذاب میں رکھنے کے لیے کافی ہے۔

"مجھ سے میرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ" اگر اس کے بغیر بھی جہنم میں جھونک دیا جاؤں تو اچھا ہے۔ میں جلایا جاؤں گا تو ہائے واویلا کروں گا اور

کہ زہاد مینو نشین زاں صدا
بہ افشاندن دست کوبند پا

جنت کے سکھ لینے والے عابد زاہد لوگ میری چیخ پکار سن کر خوش ہوں گے۔ تالیاں بجائیں گے، ناچیں گے، لیکن خیر تو میری نہیں مانتا، یہی اصول طے کر رکھا ہے کہ جس نے زندگی میں جو کچھ کیا اس کا شمار ضرور کیا جائے تو سن:

دریں خستگی پورزش از من مجو
بود بندۂ خستہ، گستاخ گو
دل از غصہ خوں شد نہفتن چہ سود
چو ناگفتہ دانی نگفتن چہ سود

تنگ آچکا ہوں اب مجھ سے عذر معذرت کی امید نہ رکھ۔ آدمی تنگ ہوگا

تو گستاخی پر آتر آئے گا۔ میرا دل غم و غصے نے لہو کر دیا ہے۔ اب شکوے کو سینے میں رکھنے سے کیا فائدہ۔ یوں بھی تجھے سب خبر ہے۔ نہ کہنے سے کیا حاصل (تیرا شکوہ تجھی سے کرتا ہوں)۔

تجھے معلوم ہے کہ میں کوئی کافر نہیں ہوں۔ آگ اور سورج کی پوجا نہیں کرتا:

نکشتم کسے را بہ اہرِمنی
نبردم زکس مایہ در رہزنی

نہ یہ شیطانی یا دغا بازی مجھ سے سرزد ہوئی کہ کسی بندہ خدا کو جان سے مار دیا ہو نہ کسی کو راہ میں لوٹا نہ مال و اسباب چھینا۔

مگر مے کہ آتش بگورم از وست
بہ ہنگامہ پرواز مورم از وست
من اندوہ گیں و مے اندوہ ربا
چہ می کردم اے بندہ پرور خدا

(زیادہ سے زیادہ یہی کیا نا کہ) شراب پی لی۔ جس نے میری قبر میں آگ جھونک دی ہے اور شراب بھی کیا؟ ایسے جیسے چیونٹی کے پر نکل آتے ہیں کہ اڑتی ہے تو اپنی موت کی طرف ہی بڑھتی ہے۔ میں بھی پی پلا کر ذرا اڑ لیتا تھا۔ میں ایک غم کا مارا، اور شراب کی خاصیت یہ کہ غم غلط کر دیتی ہے۔ اس لیے پی لیتا تھا۔ اے بندہ پرور! آپ ہی فرمایئے یہ نہ کرتا تو کیا کرتا۔

حسابِ مے و رامش و رنگ و بو — زجمشید و بہرام و پرویز جو
کہ از بادہ تا چہرہ افروختند — دلِ دشمن و چشم بد سوختند
نہ از من کہ از تابِ مے گاہ گاہ — بدریوزہ رخ کردہ باشم سیاہ
نہ بستاں سرائے نہ مے خانۂ — نہ دستاں سرائے نہ جانانۂ
نہ رقصِ پری پیکراں بربساط — نہ غوغائے رامش گراں در رباط
شباں گہ بہ مے رہنمونم شدے — سحر گہ طلبگار خونم شدے
تمنائے معشوقۂ بادہ نوش — تقاضائے بیہودۂ مے فروش

میری بادہ کشی، موسیقی اور تھوڑی بہت رنگینیٔ محفل کا ایسا ہی حساب لینا ہے تو مجھ سے کیا لینا ہے۔ (شراب کے موجد) جمشید سے، بہرام و پرویز جیسے طاقتور بادشاہوں سے لے کہ پینا تو ان کا پینا تھا۔ شراب چڑھا کر دشمن کے دل اور بدخواہ کی آنکھ میں جلتی سلائی ڈال دیتے تھے۔ میرا پینا کس شمار میں ہے کہ کبھی کبھی شراب ہاتھ آگئی تو پی لی۔ چہرے پہ زرا رنگ آگیا اور یوں "بھیک کے نور اور مانگے کے اجالے" سے سیاہ روئی کمالی۔ نہ باغ بغیچہ نہ سلیقے کے مے خانے، نہ مطرب نہ یار جانی، نہ محفل کے فرش پر لچکیلے پیکروں کا ناچ، نہ دیوان خانے میں آرکسٹرا کا شور۔ یہ تھی میری مے نوشی ساتھ پینے والی دل ربا کی تمت رات گئے پینے کی طرف اکسا کر لے جاتی تھی اور صبح ہوتے شراب کے ٹھیکے والا قرض کی ادائیگی کا تقاضا لیے میرا لہو پینے پر تلا ہوا ہوتا تھا۔

بسا روز باراں و شب ہائے ماہ
کہ بودست بے مے بچشم سیاہ
بہاراں و من در غم برگ و ساز
در خانہ از بے نوائی فراز
جہاں از گل و لالہ پر بوئی و رنگ
من و حجرہ و دامنے زیر سنگ

بھری برسات کے بہت دن ایسے بھی گزر گئے۔ پونم کی راتیں یوں بھی نکل گئیں کہ شراب میسر نہ تھی اور دنیا میری آنکھوں میں اندھیر ہو گئی۔ بہار کا موسم اور یہاں نون، تیل کی فکر میں سر کھپا رہے ہیں۔ مفلسی کا بھرم رکھنے کو گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ رہے۔ پھولوں سے چمن کے تختے بھرے ہیں، رنگ و بو کا سیلاب ہے۔ ایک میں ہوں کہ اپنی کوٹھری میں سمٹ پڑا ہوں، ہاتھ پتھر کے نیچے آگیا ہے۔

دم عیش جز رقص بسمل نہ بود
باندازۂ خواہش دل نہ بود
اگر تافتم رشتہ گو ہر شکست
دگر یافتم بادہ ساغر شکست

عیش وراحت کا جو لمحہ نصیب ہوا وہ ایسا تھا جیسے خنجر تلے ہاتھ پاؤں پٹکنا
اس سے دل کے ارمان کہاں پورے ہوتے۔ حالت یہ رہی کہ اگر ہار بنانے کو تاگا
بٹ گیا تو موتی ٹوٹ گیا۔ اور اگر شراب ہاتھ آگئی تو پیالے کے ٹکڑے اڑ گئے

سراز منت ناکساں زیر خاک
لب از خاک بوس خساں چاک چاک

بہ گیتی درم بے نوا داشتی
دلم را اسیر ہوا داشتی

نہ بخشندہ شاہے کہ بارم دہد
بہ بار زر و پیل بارم دہد

کہ چوں پیل زانجا برانگیزمے
زرش بر گدایاں فرو ریزمے

نہ نازک نگارے کہ نازش کنم
بہ بوسہ زلف درازش کشم

دایسی زندگی میں نے بسر کی کہ نااہلوں کے احسان سے سر جھکا ہوا اور
کمینوں کی قدم بوسی کے مارے ہونٹ ادھڑے ہوتے۔ دنیا میں تو نے مجھے بے نوا
رکھا اور اس بے نوائی پر ستم یہ کہ دلوں میں آرزوئیں بھر دیں۔ نہ ایسا دریا دل بادشاہ
جس کے دربار میں میری رسائی ہو۔ جب بخشنے پر آئے تو اتنا سونا دے جسے ہاتھی
پر لاد کر نکلوں اور محتاجوں، ضرورت مندوں پر بوچھار کرتا چلوں۔ نہ ایسا نازک
بدن محبوب جس کے ناز اٹھاتا، پیار کرنے میں لمبی زلفیں کھینچ لیا کرتا۔

چوں آں نامرادی بہ یاد آیدم
بہ فردوس ہم دل نیا سایدم

جب مجھے اپنی زندگی میں یہ ناکامیاں یاد آتی ہیں تو جہنم کیا جنت
میں بھی جی نہیں لگتا۔

دراں پاک مے خانۂ بے خروش
چہ گنجائی شورش ناے و نوش

سیہ مستی ابر و باراں کجا
خزاں چوں نہ باشد بہاراں کجا

جنت تو ایک پاک میخانہ ہے جس میں دھوم دھڑ کا کچھ بھی نہیں۔ اس میں ہو حق کی گنجائش کہاں۔ مدہوش کرنے والی برسات نہ گھنگھور گھٹائیں، تیری جنت ایک رنگ پر ہے جب اس میں خزاں ہی نہیں آتی تو بہار کا کیا لطف ہوتا ہوگا۔ رہا یہ کہ وہاں حور و قصور ہیں تو کیا۔

چہ منت نہد ناشناسا نگار
چہ لذت دہد وصل بے انتظار
گریزد دمِ بوسہ اینش کجا
فریبد بہ سوگند دینش کجا
برد حکم و نبود لبش تلخ گو
دہد کام و نبود دلش کام جو

ایسی حسینہ جس سے پہلے کی جان پہچان نہ ہو، کیا احسان دھرے گی۔ جس نے انتظار کی کسک نہ جانی ہو وہ دائمی وصل سے کیا لذت پائے گا۔ اس حور کو بھلا یہ کہاں آتا ہے کہ ہم پیار کرنے لگیں تو وہ ہاتھ چھڑا کر بھاگ لے۔ اس کے دین ایمان میں جھوٹے قول و قسم سے دلاسے دینے کا بھی تو چلن نہیں ہے۔ اس نیک بخت حور کو تو بس حکم کی اطاعت کرنے سے کام، یہ تھوڑی ہے کہ ہم پیش دستی کر بیٹھیں تو وہ کڑوی کسیلی سنا ڈالے۔ یہ بھی کیا یک طرفہ معاملہ ہوا کہ ہماری تسکین کرنے کو تو آمادہ لیکن خود اس کے دل میں کوئی بے تابی اور بدن کو پیاس نہیں۔

ہمیں تو اس طرح کی حسرتیں تھیں اور اب بھی دل میں وہی بھری ہیں۔ اب اگر پوچھ گچھ پہ بات گئی تو:

بہر جرم کز روئے دفتر رسد
زمن حسرتے در برابر رسد
بفرمائے کایں داوری چوں بود
کہ از جرم من حسرت افزوں بود

میرے اعمال نامہ میں ایک طرف اگر جرم درج ہو گا تو مقابلے میں ایک حسرت رکھ دوں گا۔ بتا کہ یہ کیسی عدالت ہو تی جب تو دیکھے کہ میرے گناہوں سے تو حسرتیں ہی بڑھ چلی ہیں۔

ایسی حالت میں جزا و سزا کے خیال سے باز آ اور خیریت اسی میں ہے کہ آج تک کی ساری خطائیں معاف کر۔

دگر خون حسرت ہدر کردۂ
زپاداشش قطع نظر کردۂ

اب اگر تو نے حسرتوں کا خون معاف کیا اور ان کا خون بہا مجھ کو نہ دیا، جزا و سزا کی پوتھی بند کر دی تو پھر یہ گناہگار بھی اپنی حسرتوں کا دباؤ نہیں ڈالے گا بلکہ امیدوار ہو کر بیٹھ جائے گا۔

بہ بند امید استواری فرست
بہ غالب خط رستگاری فرست

لے میرا تیرا قضیہ ختم۔ امید کی کڑی مضبوط کر اور نجات کا پروانہ غالب کے نام جاری کر دے۔

داور محشر سے گناہوں کا قصہ تو پاک کرالیا۔ اب نبوت کے دروازے پر دستک دیتے ہیں۔ "کلک قدسی صریر" سے کہتے ہیں کہ نعت رسولؐ لکھ۔

محمدؐ کز آئینہ روئے دوست
جز ینش نہ وانسبت وانا کہ دوست
زہے روشن آئینہ ایزدی
کہ وروے نہ گنجیدہ زنگ خودی

رسول اللہؐ خدا کے روپ کا آئینہ ہیں۔ اہل عقل جانتے ہیں کہ محمدؐ خود وہی ہیں۔ ایزد کی صفات کا روشن آئینہ۔ ان کی ذات الگ سے اپنا وجود نہیں رکھتی۔ (بلکہ ذات خداوندی ہی کا جلوہ ہے)۔

دس اشعار کی نعت کے بعد کہا ہے:

بخوئے خوشش اندوہ گاہ ہمہ   بآمرزش امید گاہ ہمہ

اپنی خوش خلقی کی بدولت ہر ایک کا دکھ بٹانے والے اور خود کو بخشوانے میں
سب کو انہی سے امید ہے۔

نہی قبلۂ آدمی زادگان
نظر گاہ پیشیں فرستادگان

کیا کہنے ہیں انسانوں کے اس قبلہ گاہ کے جس پر پہلے کے پیغمبروں کی نگاہ لگی ہوئی تھی:

بحراب مسجد رخ آراستے دیر
باندیشں خویش د دعا گوئے غیر

مسجد کی محراب میں بیٹھ کر بت کدوں کا سدھار کر دیا اور ایسے تھے کہ اپنوں
کی فکر، غیروں کی بھلائی کی دعا کی۔ عجیب اعتقادی شعر ہے:

زخونے کہ در کربلا شد سبیل
ادا کرد دام زمان خلیل

وہ خون جو کربلا میں پانی کی طرح بہے گا وہ خون نذر دے کر انہوں
نے حضرت ابراہیم کے زمانے کا قرض ادا کر دیا۔

یہاں سے شاعر نے معراج نبوی کے واقعے پر توجہ کی ہے اور ۴۲ شعر میں
معراج کا عین اسی طرح بیان ہوا ہے جس طرح میلاد کی کتابوں میں ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے
کہ یہاں شاعر نے اپنا زور تخیل بھی ملا دیا ہے۔

ایک ایسی رات جو دن سے زیادہ روشن تھی اور رسول کو خدا کا پیغام پہنچا
کہ "خداوند گیتی خریدار تست" موسیٰ نے جب خدا کا جلوہ دیکھنا چاہا تو جواب ملا کہ
"لن ترانی یا موسیٰ" (موسیٰ تم مجھے دیکھ نہیں سکتے) لیکن:

توی کانچہ موسیٰ باد گفتہ است
خداوند یکتا بتو گفتہ است

وہ آپ ہی کی ذات ہے کہ جس طرح موسیٰ نے خدا سے خواہش کی تھی کہ رب ارنی۔
(خدایا مجھے خود کو دکھا دے) اسی طرح خدا آپ سے چاہتا ہے کہ جلوہ دکھایئے۔

پھر "براق" کا ذکر ہے جو برق کی طرح انہیں زمین سے اوپر ساتوں آسمانوں سے
گزارتا ہوا لے جاتا ہے۔ اس بیان کی چستی اور تیزی میں Space Flight کا عالم

ہے. مزے دار بات یہ ہے کہ پانچویں مرحلے سے گزرتے وقت ایک مقام ایسا بھی آتا ہے

جہاں:

صف آرا گروہے ز بہرامیاں
چو پیرامن کعبہ احرامیاں
نیاگان من تاجہانباں پشنگ
قدم بہ قدم اندراں حلقہ تنگ

بہرام کی نسل کا ایک (سپاہی زادہ) صف بستہ گروہ اس طرح ان کے گرد سمٹ آیا ہے جیسے کعبے کے چاروں طرف لوگ احرام باندھے ہوتے. میرے بزرگ اوپر سے لے کر پشنگ سپہ سالار تک قدم سے قدم ملاتے ایک حلقے میں کھڑے تھے. پھر چھٹے مرحلے پر:

دراں پردہ ہندوے واژوں پسیج   بہ زنار تابی کفش خوردہ پیچ
سراسیمہ از بس بہ تعظیم جست

اس (بلند مقام) پر ایک ہندو بھی تھا جس کی انگلیاں جنیو بٹنے میں الجھی ہوئی تھیں. وہ ہڑبڑا کر مان دینے کے لیے اٹھا.

ساتوں طبقوں سے گزر کر جب رسولؐ کی سواری ستاروں کے جہاں سے گزرنے لگی تو ایک ایک برج نے تعظیم دی. یہاں ایک اچھوتی تشبیہ سوجھی ہے کہ آسمانی برج ثور (بیل کی صورت) کو بنا سنوار کر راستے میں کھڑا ہو گیا. ٹھیک اس طرح جیسے ہندوستان کے بعض گئوشالہ والے فقیر کوڑیوں کی مالا سے اپنی گائے سجا کر سرِراہ کھڑے ہو جاتے ہیں اور گاتے جاتے دان طلب کرتے ہیں.

سارے "ثوابت و سیارہ" سے گزر کر رسولؐ نویں مقام پر جا پہنچے جسے عرش (معلیٰ) کہتے ہیں. یہ وہ مقام ہے کہ اگرچہ:

بود گرچہ برتر از افلاکیاں   ولے لرزد از نالۂ خاکیاں
دل بے نواے گر آید بہ درد   نشیند بداں پایۂ پاک گرد
صداے شکست کمر گاہ مور   دریں جاست ہیچ و دراں پردہ شور

عرش کا تصور غالب کے ہاں ایک ایسے بلند مقام کا ہے جو افلاک سے اوپر ہونے کے باوجود دھرتی کے باسیوں کی فریاد سے لرز جاتا ہے. اگر کسی مفلس کے

دل سے دکھ بھری صدا اٹھتی ہے تو عرش کا پایہ غبار آلود ہو جاتا ہے. چیونٹی کی ننھی سی کمر ٹوٹے تو یہاں زمین پر ادھر دھیان بھی نہ جاتے لیکن عرش وہ پاکیزہ مقام ہے کہ وہاں اس پر شور اٹھتا ہے.

عرش سے گزر کر قدمِ رسولؐ اب اس جگہ پہنچا ہے جسے ہم جگہ بھی نہیں کہہ سکتے. جہاں تینوں ڈائی مینشن اور زمان و مکان اپنی حیثیت کھو بیٹھتے ہیں. نظر کا غبار لاپتہ ہو جاتا ہے.

غرض وہ خلوت آگئی جہاں ذات خداوندی کے سوا کچھ نہیں. دوئی کا پردہ نہیں رہتا:

زگفتن شنیدن جدائی نداشت
نمودن ز دیدن جدائی نداشت

جہاں کہنا اور سننا ایک ہی عمل ہے. دکھانا اور دیکھنا شاہد و مشہود الگ نہیں رہتے. تمام عالم وجود "حب ظہور" کی بدولت علمِ خداوندی سے اُتر کر مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوا ہے. جب رسولؐ ذات حق میں جا ملے تو یہ ایسا ہے جیسے خورشید کی شعاعیں خورشید میں آکر مل جائیں.

اس کے بعد فوراً زمین کی طرف واپسی ہوئی ہے. دروازے کی زنجیر ہلتی ملی. بستر اور تکیہ ویسا ہی گرم پایا. گویا کہیں گئے ہی نہیں تھے. پیر کا نشان جہاں بنایا تھا وہیں پیر پڑا. صبح نماز کے وقت حضرت علی کا دیدار ہو گیا.

شب از بادۂ قدس ساغر گرفت
صبوحی ز دیدار حیدر گرفت

رات کو تو اس روحانی محفل کا جام پیا اور صبح ہوتے ہی لذت علی کے دیدار سے حاصل ہو گئی.

دو چشم ست ہر چشم را بینشست
ولی آنچہ بینند ہر دو یکے ست

محمدؐ اور علی دونوں ظاہر اور روشن آنکھیں ہیں لیکن جو انہیں نظر آتا ہے وہ ایک ہی ہوتا ہے.

حضرت علی کا نام زبان پر آتے تو غالب کی روح جھوم اٹھتی ہے۔ ۱۲۸ شعروں تک منقبت چلی جاتی ہے اور کیا زور و شور ہے۔
کہتے ہیں کہ:

بہر گوشہ از عرصۂ ایں طلسم
دہد روشنائی جداگانہ اسم

یہ جو مایا کا جال آنکھوں کے آگے پھیلا ہوا ہے اس کے ہر ایک گوشے میں جوت پھیلی ہے۔ البتہ روپ میں اس کے نام جداگانہ ہیں۔ روشنی ایک ہے اور نام الگ الگ۔ میری زبان پر بھی علی کا نام ہے۔

بلندم بہ دانش نہ پستم ہمی
بدیں نام یزداں پرستم ہمی

عقل میں نہ تو اونچا اڑتا ہوں نہ ایسا گیا گزرا ہوں، میں حق کو اس نام کے ساتھ پوجتا ہوں۔

نیاساید اندیشہ جز با علی ز اسما بہ نیندیشم الا علی
بہ بزم طرب ہم نوایم علی ست بہ گنج غم اندہ ربایم علی ست
بہ تنہائی ام راز گوئی باوست بہ ہنگامہ ام پایہ جوئی از وست

میرے فکر و خیال کو علی کے سوا کسی صورت کل نہیں پڑتی، خدا کے جتنے نام ہیں ان ناموں میں اسم علی میرے دل و دماغ میں بس گیا ہے۔ عیش کی محفل میں وہ میرے دم کے ساتھ، غم کے ہجوم میں وہ میرا غمگسار، تنہائی میں اسی سے دل کی بات ہوتی ہے، طوفان برپا ہو تو اسی سے حوصلہ یا "انسپریشن" ملتا ہے۔
اسی بہاؤ میں وہ حضرت علی کی منقبت کرتے نکل گئے ہیں اور حد یہ ہے کہ:

نبی را پذیرم بہ پیمان او
خدا را پرستم بہ ایمان او
خدایش روا نیست ہر چند گفت
علی را توانم خداوند گفت

نبی کی نبوت بھی اسی لیے میرے گلے اتری کہ علی نے اس سے پیمان باندھا

تھا اور خدا پر بھی اسی خاطر ایمان لایا کہ وہ علی کا ایمان ہے۔ میں تو علی کو اپنا مالک و آقا یا خداوند کہتا ہوں۔ وہ بھی یوں کہ انہیں خدا نہیں کہا جا سکتا۔

علی اور نبی دراصل ایک ہی ہیں۔ ان کے بدن دو سہی۔ نور ایک ہے اور اسی لیے نبی کا سایہ نہ تھا۔ کیونکہ دونوں کا ایک ہی سایہ کافی تھا۔ نبی کے بعد علی کا ہی مقام آتا ہے۔ اور اسی سلسلے سے مہدی تک علی کے جانشینوں کا سلسلہ رواں ہے۔ احمد میں الف ایزد یا اللہ کا میم محمد کا الف اور میم کے عدد اگر احمد میں سے نکال لیے جائیں تو حد کے بارہ کے سوا کچھ نہیں بچتا۔ (یعنی بارہ امام)

خرد زلہ خوارش بہ فرزانگی
قضا پیش کارش بہ مردانگی

عقل اس کی دانائی کے دستر خوان کی ٹکرہ گدا ہے۔ اور موت اس کی مردانگی کے سامنے دست بستہ حاضر ہے۔

رواں وخرد گردے از راہ او
نہ ایزد ولے کعبہ درگاہ او

انسانی روح اور انسانی عقل دونوں اس کے راستے کا غبار ہیں۔ (صرف اپنے شہسوار کا پتہ دینے والی) وہ خدا نہیں لیکن پھر بھی اس مقام پر ہے کہ کعبے کو اس کی ڈیوڑھی سمجھنا چاہیے۔

کسانے کہ اندازۂ پیش آورند
سخن ہا ز آئین وکیش آورند
بہ نادانی از شور گفتار من
سگالند ز انگونہ ہنجار من
کہ آرایش گفتگو کردہ ام
بحیدر ستائی غلو کردہ ام

وہ لوگ جو ناپ تول کے بہت عادی ہیں۔ مذہب اور عقیدے کی نوعیت کا سوال اٹھاتے ہیں۔ میں جو علی علی بہت کرتا ہوں تو یہ حضرت اس طرح میرے متعلق فتویٰ دیتے ہیں کہ ہو نہ ہو "آرائش، گفتگو" کی خاطر میں علی کی تعریف

میں مبالغے کی حد سے گزر جاتا ہوں۔ [1]

مبالغہ کس کا مجھے تو شرم مارے ڈالتی ہے کہ پوری طرح علی کی مدح نہیں کر سکتا۔ مجھے دنیا کے طعنوں سے کیا لینا۔ ضرورت اپنے ممدوح کی ہے۔ اسی کو سنانا ہے:

چو انخواہم حدیثے سرودن ازو
بود گفتن از من، شنودن ازو

جب اس کی بات زبان پر آتی ہے تو مطلب یہ کہ میں کہوں اور وہ سنیں۔ کوئی اور مخاطب نہ ہو

تو غافل ز ذوق ثنا گوئیم
سزا گوئی و ناسزا گوئیم
مرا ناسزا گفتن آئیں مباد
لب من رگ ساز نفریں مباد

تمہیں کیا خبر کہ مجھے علی کی ثنا گوئی کا ذوق وشوق کتنا ہے۔ میرے تولا اور تبرا کو تم کیا جانو گے۔ برا کہنا، ناوا جب کلمے زبان سے نکالنا میرا طریق کبھی نہ ہوگا۔ میرے لبوں پر تبرائی حرف نہیں آ سکتا۔ کیونکہ:

کہ تاکینہ از مہر بشناختم
بہ کس غیر حیدر نہ پرداختم

ا۔ معلوم ہوتا ہے کہ قلعے کی ملازمت (۱۸۵۰ء) سے پہلے ہی شہر میں یہ شہرت ہوگئی ہوگی کہ غالب "ماوراء النہری سنی" سے شیعہ ہو گئے۔ غالب اپنے اوپر کسی لیبل کو کیسے برداشت کرتے۔ انہوں نے اسی پر جل کر کہا ہوگا:

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری
کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
دہری کیوں کر ہو جو کہ ہووے صوفی
شیعی کیوں کر ہو ماوراء النہری

بظاہر یہ استفہام انکاری ہے لیکن "کیوں کر" کا جواب غالب کے کلام سے مل جاتا ہے۔

جوانی بریں در بسر کردہ ام
شبے در خیالش سحر کردہ ام

جب سے مجھے اتنا شعور ہوا ہے کہ محبت اور نفرت کے درمیان تمیز کر سکوں تب سے میں نے حیدر (علی) کے سوا کسی سے لو نہیں لگائی۔ اسی دروازے پر میں نے جوانی کا زمانہ گزار دیا۔ گویا وہ رات تھی جو ان کے تصور میں ہی بسر ہو گئی۔

آخر میں تمنا ظاہر کی ہے کہ چاہے ہندوستان میں ہوں، عراق میں، باغ میں، بیابان میں، لیکن میری بازگشت علی کی طرف ہو۔ عرفی شیرازی (اکبر اور جہانگیر کے زمانے کا جوان مرگ شاعر) پر رشک کیا ہے کہ وہ علی علی کہتے دنیا سے گیا اور نجف میں (جہاں حضرت علی کا مزار ہے) خود کو دفن کرا لیا۔ خدائے بخشندہ میری بھی یہ آرزو پوری کر دے۔

که دل خستهٔ دہلوی مسکنے ز خاک نجف باشدش مدفنے
ز غالب نشاں جز بر آں در مباد چنیں باد فرجام و دیگر مباد

کہ دہلی شہر کا یہ دل شکستہ باشندہ غالب نجف کی مٹی میں مل جائے اور اسی چوکھٹ پر اس کا آخری نشان باقی رہے۔ اس کے سوا اور کوئی انجام نہ ہونے پائے۔

انجام کی فکر سے نپٹنے کے بعد غالب اپنے افکار کی دنیا میں جلوہ گر ہیں۔ مغنی سے خطاب کرتے ہیں کہ ایسا گل نغمہ بکھیر و جو "میرے دل سے غم نہیں بلکہ پہلو سے دل ہی نکال لے جائے۔"

تو دانی سخن در سخن می رود

تم جانو بات سے بات نکلتی ہے،

سخن گرچہ گنجینہ گوہر ست
خرد را ولے تابشے دیگر ست
ہمانا بہ شب ہائے چوں پر زاغ
نہ بینی گہر جز بہ روشن چراغ
بہ پیرایش ایں کہن کارگاہ
بہ دانش تواں داشت آئیں نگاہ

بود بستگی را کشاد از خرد
سر مرد خالی مباد از خرد

کلام یا شاعری یوں تو موتیوں بھرا خزانہ ہے لیکن عقل کی بات ہی کچھ اور ہے، اس کی روشنی اس روشن چراغ کی سی ہے جس کے بغیر گھور اندھیری رات میں آدمی کو موتی بھی نہیں سوجھتے۔ دنیا کے اس پرانے کارخانے کی کاٹ چھانٹ میں، اس کے بنوانے سنوارنے میں عقل ہی تدبیریں سجھاتی ہے۔ تنگ دلی اور تنگ نظری کو دور کرنے والی انسان کی عقل ہی ہے۔ خدا نہ کرے کہ آدمی عقل سے بے نیاز ہو جائے؛

خرد چشمۂ زندگانی بود خرد را بہ پیری جوانی بود
فروغ سحرگاہ روحانیاں چراغ شبستان یونانیاں

عقل ہے آدمی کی، جو زندگی کا سرچشمہ ہے اور جب آدمی بوڑھا ہوتا ہے تو عقل جوان ہو جاتی ہے۔ روحانی لوگوں کی صبح کا اُجالا یہی ہے اور یونان کے اہل علم و فن کے خوابگاہ کا چراغ ہے؛

اناں پیش کایں پردہ بالا زنند
نگہ را صلائے تماشا زنند
نخستیں نمودار ہستی گرائے
خرد بود کامد سیاہی زدائے

زندگی کے اس ڈرامے کا پردہ اٹھنے سے پہلے اور نگاہ کو سیر تماشا کی عام دعوت دینے سے پہلے یہی عقل تھی جس نے سب سے پہلے عالم وجود میں قدم رکھا اور تاریکی کے جالے صاف کر دیئے؛

کسے کو از دم روشنائی زند
بخود فال دانش ستائی زند
دریں پردہ خود را ستا آتش گرفت
کہ دانند مردم کہ دانش ور ست

وہ جو دوں کی لیتا ہے عقل کی روشنی حاصل ہونے کے دعوے کرتا ہے دراصل

اس بہانے خود ستائی میں مبتلا ہے تاکہ لوگ اسے دانشور شمار کریں۔

غالب نے یہاں پہنچ کر اپنے عقابی بازو پھیلا دیتے ہیں۔ عقل کا سخن سے، آرٹ سے کیا تعلق ہے، غم اور درد مندی سے کیا واسطہ ہے۔ اسے کم و بیش پچاس شعروں میں بیان کیا ہے:

خرد جویم از خود بود مرگ من ۔۔۔ بہ ہستی خرد بس بود برگ من
سخن گرچہ پیغام راز آورد ۔۔۔ سرود از چہ در اہتزاز آورد
خرد داند ایں گوہریں در کشاد ۔۔۔ ز مغز سخن گنج گوہر کشاد
خرد داند آں پردہ بر ساز بست ۔۔۔ برامش طلسمے ز آواز بست
بدانش تواں پاس دم داشتن ۔۔۔ شمار خرام قلم داشتن
بمستی خرد رہنمائے خود است ۔۔۔ رود گر ز خود ہم بجائے خود ست

اگر عقل کے ہاتھوں موت بھی آتی ہو تو آجائے، میں عقل کا ہی طلب گار ہوں۔ زندگی میں ایک ہی سروسامان مجھے چاہیے وہ ہے خرد۔ کلام میں وہ پہنچ سہی کہ راز کی بات سینے سے نکال لاتا ہے اور موسیقی میں یہ کمال سہی کہ روح جھوم اٹھتی ہے۔ (اہتزاز یعنی ECSTASY طاری ہو جاتی ہے) تاہم وہ عقل ہی ہے جو ان موتیوں کا در کھولنا جانتی ہے۔ عقل کے ناخن کلام کے مغز سے جواہرات کا خزانہ کھولنا جانتے ہیں۔

صرف شاعری یا نثر نہیں بلکہ موسیقی میں بھی عقل کا دخل ہے۔ عقل ہی ساز پر وہ پردہ چڑھانا جانتی ہے کہ ادھر تار بجے ادھر آواز کا ایک طلسم بندھ جائے۔

عقل ہی کے ذریعے آدمی کو یہ پتہ چلتا ہے کہ کتنا سانس چھوڑ دے، کتنا روکے۔ عقل ہی بتاتی ہے کہ قدم کو کتنے قدم چلنا ہے اور کب تھمنا ہے۔

مستی کے عالم میں بھی عقل اپنی رہنمائی کرتی ہے بہکے بھی تو بھٹکتی نہیں۔

تیرہ شعر کے بعد کہتے ہیں:

زہے کیمیائے معانی سخن
بخود زندہ جاودانی سخن

سخن یا کلام خوش (الفاظ کی نہیں) معانی کی کیمیا ہے۔ اس کے کیا کہنے
وہ اپنے دم سے زندۂ جاوید ہے۔

سخن بادہ اندیشہ مینائے او
زباں بے سخن لائے پالائے او

سخن ایک شراب کے مثل ہے اور غور و فکر اس کی بوتل ہے وہ زبان جس پر
(دل کش) سخن نہ آسکے ایک صافی ہے کہ نہ شراب نہ بوتل:

ز دودن ز آیینہ زنگار برد
ز دانش نگہ ذوق دیدار برد

آیینے کو خوب گھس کر چمکایا گیا تو اس کا دھندلا پن جاتا رہا۔ اسی طرح
نگاہ کو شوق تماشا عقل سے میسر آیا ہے۔ (جب عقل نے اس آیینے کو گھس کر چمکا دیا)

خرد کردہ عنواں بینش درست
رقم سنجی آفرینش درست
فروغ خرد فرۂ ایزدیست
خدا ناشناسی ز نابخردیست
نظر آشنا روئے دانائیش
عمل روشناس توانائیش

عقل نے ہی بصیرت کی راہیں کھولی ہیں اور اس عالم آفرینش کی تحریر
پر اصلاح کر دی ہے۔ یہ عقل کا نور ہے۔ جس میں پیدا کرنے والی قوت کا شکوہ پایا جاتا
ہے۔ خدا کو نہ پہچاننا عقل کے استعمال سے بے خبری ہے۔ نگاہ اس دانائی کی صورت
پہچانتی ہے اور عمل میں اس کی قوت کا سامنا ہوتا ہے۔

اس کے فوراً بعد ایک ایسا شعر ہے جسے فلسفہ اخلاق میں ضرب المثل ہونا
چاہئے تھا۔

ز اندیشہ دم زد نظر نام یافت
بہ کردار رفت از اثر کام یافت

جب عقل انسان کی فکر میں دخیل ہو جاتی ہے تو اسی کا نام نظر ہے۔ (یعنی بصیرت) اور

جب وہ روزمرہ کے عمل میں گھل مل جاتے تو تاثیر پیدا کر لیتی ہے۔

غضب را نشاط شجاعت دہد
ز خواہش بہ عفت قناعت دہد
باندازہ زور آزمائی کند
خورد بادہ و پارسائی کند

انسان میں غصے اور بے قابو ہونے کا جو جذبہ ہے، عقل اسی کو شجاعت یا دلیری کی ترنگ میں تبدیل کر دیتی ہے۔ (نفس کی خواہش اگر بے قابو ہو تو نفس پرستی اور ہوس لیکن) عقل کی احتیاط شامل ہو جاتے تو اسی کو قناعت کی صفت بنا دیتی ہے۔ اپنی قوت کے اندازے سے زور آزمائی کرنا سکھاتی ہے۔ عقل وہ شے ہے کہ نشے میں رہ کر بھی پارسائی قائم رکھتی ہے۔

اگر قول و عمل پر عقل کا فرمان چلے تو آدمی کی عادتیں سنور جاتی ہیں اور انجام بخیر ہوتا ہے۔ یوں سمجھو کہ ایک آدمی شکار کرنے نکلتا ہے۔ خونخوار چیتا اس کے ہمرکاب ہے اور وہ شخص شکار کے فن سے اور اندازے کی رہنمائی سے محروم ہے تو جنگل میں بھٹک جائے گا۔ نہ شکار ہاتھ آئے گا نہ راستہ ملے گا۔ چیتا پتھر پر پنجے مارے گا۔ گھوڑے کے پاؤں شل ہو جائیں گے۔ شکار کے تمام سروسامان کے ساتھ دانش کی رہنمائی بھی درکار ہے۔

بہ دانش غم آموزگار من است
خزان عزیزاں بہار من ست
غمے کز ازل در سرشت من است
بود دوزخ اما بہشت من است

یہ غم اور دکھ ہے جس نے مجھے دانش کا سبق پڑھایا۔ وہی غم جو دوسروں کو اجاڑ دیتا ہے مجھے بہار بخش گیا۔ غم تو ازل سے میری تقدیر میں لکھا تھا۔ یہ کتنا ہی اذیت ناک ہو لیکن میرے لیے جنت کا مرتبہ رکھتا ہے۔

اب وہ شعر آتے ہیں جنہیں سمجھے بغیر نہ غالب کو سمجھا جا سکتا ہے اور نہ کسی ترقی یافتہ زبان کی بڑی شاعری کو۔

زمن جوی در بد نکو زیستن ‏ جگر خوردن و تازہ روزیستن
درشتی بہ نری زبوں داشتن ‏ رسد گر ستم غمزہ پنداشتن
بعجز از دوروں سو، جگر سوختن ‏ بہ ناز از بروں سو، رخ افروختن
بدریوزہ گنجینہ اندوختن ‏ بہ بازیچہ دانائی آموختن
شگفتن ز داغے کہ بر دل بود ‏ نہفتن شرارے کہ در دل بود

سیکھنا ہے تو مجھ سے سیکھو کہ برے حالات میں مزے کی زندگی کیونکر گزاری جاتی ہے۔ اپنا جگر کھا کر خوش وخرم کیسے عمر بسر کی جاتی ہے۔ نرمی سے زندگی کی سختیوں کے دانت کھٹے کر دینا اور ہر آنے والی مصیبت کو ایک شرارت سمجھ کر چپ ہو رہنا کچھ مجھی کو آتا ہے۔ سینے کے اندر سے انکساری اور عاجزی کے ساتھ جگر کا دھواں اٹھے اور باہر سے فخر و ناز کے عالم میں چہرے کی رونق نظر آئے۔ دوسروں کے علم وعقل سے ایک خزانہ اکٹھا کیا جائے اور کھیل کھیل میں عقل کی باتیں دوسروں کے دلوں میں ڈالی جائیں۔ دل پر جو داغ لگے اس پر مسکرا دینا اور اندر جو چنگاریاں سمائی ہوئی ہیں انہیں اپنے وجود میں چھپا لینا:

بدیں جادہ کاندیشہ پیمودہ است
غم خضر راہ سخن بودہ است

میرے فکر وتخیل نے جو راہ طے کی ہے اس میں رہبری کرنے والا غم ہی تھا۔ وہ کوئی اور تھے نظامی گنجوی اور زلالی خوانساری جنھوں نے غم کے بجائے خضر راہ سے شاعری کا جادو منتر سیکھ لیا تھا۔

من از خویشتن با دل دردمند
نوائے غزل بہ کشیدہ بلند
نباشم گر از گنجہ گنجم بس ست
بغم گر چنیں پردہ سنجم بس ست

میں نظامی کی طرح خواب وخیال میں خضر سے درس نہیں لیتا بلکہ یہ دل درد مند ہے جو غزل کی لے اٹھاتا ہے۔ (میں نے شاعری کے فن کو اس مقام پہ پہنچا دیا ہے کہ اگر یہ الوہی نغمہ وحی بن کر مجھ پر اترے تو تعجب کی بات نہیں)۔

اگر میں نظامی کی طرح گنجہ کا رہنے والا نہیں، نہ سہی۔ غم کے نغمے تو میری آواز میں سنائی دیتے ہیں یہی کافی ہے۔ دکھوں سے کچھ راحت پانے کا ایک بہانہ ہے یہ شاعری۔ مصائب کا توڑ میں نے یہ نکالا ہے کہ:

بغم خواری افسانہ گوئی کند

گھپ اندھیری رات میں مجھے چراغ کی ضرورت تھی چنانچہ:

چراغے کہ بے روغن افروختم

دلے بود کز تاب غم سوختم

وہ چراغ مجھے مل گیا اور تیل کے بغیر ہی میں نے روشن کر لیا۔ یہ دیا میرا دل تھا، جسے غم کی تب و تاب نے جلا دیا تھا۔

زیزداں غم آمد دل افروز من

چراغ شب و اختر روز من

نشاید کہ من شکوہ سنجم زغم

خرد رنجد از من چو رنجم زغم

پروردگار کی طرف سے مجھے غم بخشا گیا ہے تاکہ دل کو روشن کر لے۔ میرے حق میں یہ رات کا چراغ اور دن کا ستارہ ہے۔ میں بھلا کس منہ سے غم کی شکایت کر سکتا ہوں۔ اگر میں غم سے راضی نہ ہوں تو عقل بھی مجھ سے راضی نہ ہو گی۔

مغنی سے باتیں ہو چکیں اب ساقی نامہ شروع ہوتا ہے۔ یہ غالب کی اپنی محفل ہے۔ یہاں وہ اور بھی کھل سکتے ہیں۔ مسلسل نظموں مثلاً مرثیے، مثنوی اور قصیدے میں "ساقی نامہ" کا ٹکڑا دراصل ڈرامے کی شدت Tension کو ہلکا کرنے اور تفریحی عنصر Relaxation ڈالنے کی غرض سے ہوتا ہے۔ غالب نے یہ کام تو "مغنی نامہ" سے لے لیا، پھر اب "ساقی نامے" کی ضرورت کیا۔

لیکن ایک ہزار اٹھانوے شعر کی یہ مثنوی اندر سے شہادت دیتی ہے کہ تھم تھم کر برسوں میں لکھی گئی ہے اور اس کے لکھتے وقت موڈ اور حالات بدلتے گئے۔ "مغنی نامہ" کے اشعار لکھنے کے بعد جو نکتے سوجھے اب وہ ساقی کی معرفت ادا ہوتے ہیں

بیا ساقی آئین جم تازہ کن
طراز بساط کرم تازہ کن
بہ پرویز از مے درودے فرست
بہ بہرام از نے سرودے فرست

اے ساقی آ اور جمشید کا چلن تازہ کر دے۔ محفل کا حسن جگا دے اور دور لگا دے۔ آ کہ (شاہ ایران) پرویز کی روح کو شراب کا ثواب پہنچائیں اور (موسیقی کے پرستار) بہرام کو بانسری کی سریلی صدا کا

نظامی نے بھی اپنی مثنویوں کو ساقی نامے سے شروع کیا ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ ساقی پر ہمارا حق ہے۔ نظامی جیسے خشک مولوی کا نہیں۔ اس کے فریب میں مت آنا۔ وہ تو آسمانی فرشتے کو ساقی سمجھے بیٹھا ہے۔

ورع پیشہ مسکیں چہ داند ترا
بہ آرائش نامہ خواند ترا
رضا جوئے من شو کہ ساغر کشم
گرم نیل و جیحوں دہی در کشم

نظامی گنجوی بیچارہ نیک پرہیز گار آدمی وہ ساقی ساقی پکارتا ہے۔ تو صرف اپنے کام کی سجاوٹ کے لیے (اس سے تجھے کیا غرض) میری خوشنودی حاصل کر کہ میں جام کو اصلی جام سمجھ کر پیتا ہوں۔ جام کیا اگر دریائے نیل و جیحوں کی طرح بے تحاشا انڈیل دے تب بھی چڑھا جاؤں گا۔

ایک تو ہے کہ تھوڑی سی پی کر بہک جاتے۔ ایک میں ہوں کہ دریا چڑھا کر قابو میں رہتا ہوں۔ مگر یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ اصلیت میں:

ہمانا تو دانستہ کز دو سال
نہ نوشم مے، الا بہ بزم خیال
زلب تشنگی چوں بہ مے در خورم
تو کم تر خور امروز تا برخورم

تجھے تو خبر ہے کہ دو سال ہونے کو آتے ہیں میں نے صرف تصور میں ہی شراب چکھی ہے۔ آج جب

ایک موقع ملتا ہے تو پیاس چمک اٹھتی ہے ذرا تو کم کم پینا کہ مجھے یہ پوری پڑ جاتے۔ آج کا دن خود نہ پینا، پلا دینا۔

زخود رفتہ ترکیست ہندوئے تو
عجب نبود از خوبی خوئے تو
کہ خوئی رضائے زخود رفتۂ
دہی مے بہ ترک جگر تفتۂ

یہ تیرا ہندو غالب ایک بے قابو ترک ہے۔ تیرے حسن اخلاق سے امید تو یہی ہے کہ ایک بہکے ہوئے آدمی کی خوشنودی حاصل کرنے میں کوتاہی نہ کرے گا۔ اس جگر جلے ترک کو شراب سے نوازے گا۔ (کیونکہ ایک زمانے کے بعد اس کا ہاتھ جام تک پہنچنے والا ہے)۔

در اندیشہ محو تلاشم ہنوز
قدح سازو ساقی تراشم ہنوز
دریں داستاں نیز گر واری
بخویش ست گفتارم از بے کسی

سب خواب وخیال کی باتیں ہیں، خود ہی قدح بناتا ہوں خود اپنے تصور سے ساقی تراش لیتا ہوں۔ اس کہانی میں بھی ساقی کا نام برائے بیت آگیا ہے ورنہ بے کسی کے مارے یہاں بھی خود کلامی ہے:

مرا دستگاہ مے و شیشہ کو
نشاطے چنیں جز در اندیشہ کو

یہ میری بساط کہاں ہے کہ شراب وصراحی لے کر بیٹھوں، صرف تصور میں ان محفلوں کے مزے لیتا ہوں۔

ایک میں ہی نہیں یہ ساری انجمن حیات تصور کا کرشمہ ہے۔ ورنہ ظاہر و باطن سب وہی ایک ہے، ہر وقت، جگہ، کیفیت سب اسی ایک وجود کی جھلکیاں ہیں۔ یہ بزم شہود میں علم الہیٰ یعنی غیب کے سائے ہیں۔ سعدی نے عقل کی راہ کو پیچ در پیچ کہہ کر ایک سچی بات کہہ دی۔ دوسرا اسی راہ کا مسافر کہتا ہے کہ حق محسوس اور خلق معقول

نشاں ہائے راز خیال خودیم
نوا ہائے ساز خیال خودیم

ہم مادہ وجود کیا ہیں۔ اپنے خیال (تصور یا علم) کا اتہ پتہ دینے والے اپنے خیال کے ساز کی صدا (یہاں خودیم یا اپنے کا مطلب ہے آفرینندہ)۔

اب خود کو تھامتے ہیں کہ ذات وصفات غیب وشہود کے یہ مسائل تصوف تمہارے بس کے نہیں۔ تم ایک رند لاابالی:

تصوف نہ زیبد سخن پیشہ را
سخن پیشہ رند کش اندیشہ را

شاعر آدمی کو تصوف کے معاملات میں پڑنا زیب نہیں دیتا اور وہ بھی ایسے شاعر کو جس کے قول وعمل میں سیدھی لکیر نہیں۔ تم کوئی حکیم سنائی نہیں ہو۔ شعر کہو، غزل لکھو:

غزل گر نہ باشد نوائے دگر
سر دل سلامت ہوائے دگر

غزل نہ جڑتی ہو تو کوئی اور صنف سخن سوچو۔ دل زندہ ہے تو خواہشیں اور بھی باقی ہیں:

غزل گر ملال آرد افسانہ گو
کہن داستاں ہائے شاہانہ گو

اگر غزل سے خستگی بڑھتی ہو تو چھوڑو۔ جگ بیتی سناؤ پرانے بادشاہوں کی داستانیں نظم کرو۔ شاہنامہ لکھنا موتی پرونے کا کام ہے۔ حق وباطل کی بحث نکالنا جگر پرونے کے برابر ہے۔

نہ نالی ز غم گر جگر سفتہ شد
سخن ہائے حق بیں کہ چوں گفتہ شد

اگر جگر میں چھید ہو جائیں تو اس دکھ کی فریاد نہ کرنا۔ دیکھنے کی چیز تو یہ ہے کہ حق کی بات کس طرح کی گئی۔

آگے چل کر کہتے ہیں؛

اب کیا عمر ڈھل گئی ہے۔ وہ زور نہیں رہا۔ جب میں جوان تھا تو کالے سر پہ کلاہ پاپاخ جمی رہتی تھی۔

سیاہی ز موئے سرم زود رفت
مگر کاتش افسرد کایں دود رفت

میرے سر کے بال جلد ہی پک گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آگ بجھ گئی تو یہ دھواں بھی گیا۔

ہنسنے کی مجھے ایسی عادت نہ تھی۔ پھر بھی منہ میں دانت تو تھے۔ اب نہ ہنسنے کا مزا رہا نہ رونے کا۔ سر سے اکڑ نکل گئی پہلے میں چھریرے بدن کا دراز قد جوان تھا۔ اب بید مجنوں کی طرح جھڑ گیا ہوں۔

چہ غم گر فلک رنگم از روئے برد
توانم زخود در سخن گوئے برد
نہ نالم ز پیری جوانم برائے
ہنوزم بود طبع زور آزمائے
سخن سنج و معنی ترازم ہنوز
بشیوائی شیوہ نازم ہنوز

اگر زمانے کی گردش نے چہرے کا رنگ پھیکا کر دیا تو کوئی غم نہیں۔ فن سخن میں آج بھی بازی جیت سکتا ہوں۔ بڑھاپے کا فریادی نہیں ہوں۔ ارادہ جوان ہے۔ طبیعت میں زور آزمائی کا کس بل باقی ہے۔ اب بھی کلام لکھتا ہوں۔ باریک مضمون نکالتا ہوں۔ اور یہی نہیں بلکہ اپنے اسٹائل پر بھی مجھے ناز ہے۔ بدن میں لہو نہیں رہا لیکن آنکھ سے اب بھی ٹپکتا ہے۔

ز حرفے کہ اندر ضمیر آیدم
ہنوز از دہن بوئے شیر آیدم

جب کوئی حرف تازہ مجھے سوجھتا ہے تو منہ سے دودھ کی بو آتی ہے۔ خدا کی توفیق سے اب بھی اتنی جان باقی ہے کہ آرٹ کے میدان میں تمام پرانے طرزوں کو

ٹھکانے لگادوں اور "سخن" کو جاودانی حسن عطا کر جاؤں... کتنی اشعار کے بعد کیا آپ بیتی کا ٹکڑا زبان پر آیا ہے۔

زباں تازہ سازم بہ نیروئے بخت
بہ ذکر شہنشاہ بے تاج و تخت

(اب بھی اتنی قوت ہے کہ) بخت یاوری کرے تو بے تاج اور بے تخت بادشاہ کے ذکر سے زبان تازہ کر کے دکھادوں۔ فردوسی کے شاہنامہ لکھنے کا زمانہ گزر گیا۔

ز فردوسیم نکتہ انگیز تر
ز مرغ سحر خواں سحر خیز تر

میں فردوسی سے بڑھ کر شاعرانہ نکتے پیدا کر سکتا ہوں۔ صبح کو بانگ دینے والا مرغ اٹھتا بھی نہیں کہ میں اٹھ جاتا ہوں۔ فردوسی نے ساسانی بادشاہت کی شمع بجھنے سے پہلے کارنامے سناتے ہیں۔ میں رسول اللہ کے کارنامے شعر میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ البتہ یہ راستہ ٹیڑھا ہے۔

بہ مستی تواں نغز گفتار بود
مرا باید از خویش ہشیار بود

سرمستی کے عالم میں خوش گوئی کا لطف ضرور ہے لیکن رسولؐ کا ذکر ہو تو ذرا ہوشیار ہو جانا چاہیے۔ (با خدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار) یہ وہ محفل ہے جس کے تذکرے میں شراب و کباب کا ذکر نہیں سماتا۔ سلطنت کرنے والے بادشاہوں کا بیان کچھ اور شے ہے۔ "شہنشاہ درویش خو" کی مدح کچھ اور ہے۔

دریں بزم او باش را بار نیست
مے و ساغر و زخمہ و تار نیست

یہ وہ بزم ہے کہ مشکوک چال چلن والے کا گزر نہیں ہوتا یہاں مے اور ساغر مضراب اور تار کا کیا کام۔

بہ آزادگی خسروی می کنم
بدیں پشت دولت قوی می کنم

نباشد اگر پائے دیں درمیاں
نہم ہفتخواں بلکہ ہفتاد خواں

آزادی کے معاملے میں تو میں خود بادشاہ ہوں، آزادی کی بدولت میری کمر مضبوط ہے یہی میری سلطنت کی پشت پناہ ہے۔ میں نے موضوع ایسا اٹھایا جس میں دین ایمان کا معاملہ بیچ میں آجاتا ہے۔ ورنہ میرے ساقی تو دیکھتا کہ ہفت خواں کیا میں ستر طبق طے کر جاؤں۔

اسی انداز سے کوئی بیس شعر تک اپنے دم خم کا اعلان کرنے کے بعد خود کو تنبیہہ کرتے ہیں کہ یہاں اس ذکر میں مستوں کی سی ہو حق مت مچاؤ۔ ہمت بلند رکھو اور ادب کے ساتھ لکھے جاؤ۔ مثنوی کا آخری شعر ہے۔

ترا بخت در کار یاری دہاد
بہ پیوند دیں استواری دہاد

خدا کرے اس نیک کام میں تقدیر تمہارا ساتھ دے۔ اور دین ایمان کی سلامتی رہے۔ دین سے ان کے تعلق میں جتنی استواری تھی وہ ہمیں معلوم ہے اور یہ بھی کہ مثنوی اسی "خدا دب" پر تمام ہوگئی۔

■■

اعجاز حسین

غالب کا تنقیدی شعور

مضمون شروع کرنے سے پہلے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ میں غالب کو بہ حیثیت نقاد نہیں پیش کرنا چاہتا۔ کیونکہ میں یہ نہیں سمجھتا کہ وہ تنقید کا کوئی ایسا واضح نظریہ رکھتے تھے جو دور جدید سے اردو میں جگہ پانے لگا تھا۔ تنقید کے انداز تحریر وغیرہ جو فن نقد کے لیے ضروری عناصر ہیں وہ کسی قید و بند کے ساتھ غالب کے یہاں نہیں نظر آتے۔ مگر فن شعر و ادب کے بارے میں جو خیالات انہوں نے جا بجا اپنے خطوط میں ظاہر کیے ہیں ان سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کے شعور میں ایسے عناصر موجود تھے جو روح تنقید کے لیے ضروری ہیں۔ آج کل یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ ہر اچھے شاعر اور ادیب کے پاس کوئی نظریۂ ادب یا تنقیدی شعور ضرور ہوتا ہے جو تخلیقی عمل میں اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ غالب جدید مفہوم میں نقاد تھے، یہ ضرور ہے کہ وہ ایک ایسا تنقیدی شعور رکھتے تھے، جو کئی لحاظ سے قابلِ قدر تھا۔ ان کی نظر الفاظ کی اہمیت، زبان کی نشو و نما شعر کی خصوصیات پر تو تھی ہی، اس کے علاوہ اظہار راتے میں انفرادیت، اجتہاد، نفس مضمون پر غور و فکر، خیالات کی بلندی و پستی پر تبصرہ مرزا کے تنقیدی شعور کی نشان دہی میں کوتاہی نہیں کرتے۔ ان کے خیالات کو یہ کہہ کر نہیں ٹالا جا سکتا کہ شاعرانہ تعلی یا کسی استادی کی نمائش کا نتیجہ ہیں۔ چونکہ عبارتیں مدلل ہیں اور موقع و محل کے لحاظ سے ضبط تحریر میں آتی ہیں اس لیے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ غالب نے جو کچھ کہا وہ ان کی سوچی سمجھی راتے ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ وہ فکر و فن کے بارے میں اپنے طور پر سوچا کرتے تھے۔ بڑے اور اچھے شاعر شعر کے مقبول و بااثر ہونے کے اسباب پر غور کر کے اس نتیجے پر پہنچتے تھے کہ کیوں یہ فنکار یا اس کی تخلیق داد و تحسین کی مستحق ہے۔ کیوں کوئی

شاعر یا شعر باوجود عوام میں مقبول ہونے کے خواص میں قدر کی نگاہوں سے نہیں دیکھا جاتا۔ ان سب باتوں پر غور کرنے کے بعد وہ اپنی رائے قائم کرتے تھے جس میں اصول تنقید کی جھلک اور نقاد کی انفرادیت نمایاں ہو جاتی تھی، اور کبھی کبھی نہیں، بلکہ ہمیشہ ان کی رائے زنی سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ "خطائے بزرگاں گرفتن خطااست" کے وہ قائل نہ تھے مگر اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ وہ مستند شاعروں اور ادیبوں کی باتوں کو سند نہ مانتے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی ادیب کی غلطی کو اس لیے جائز نہیں سمجھتے تھے کہ وہ عرف عام میں بڑا فنکار سمجھا جاتا ہے۔ غرض یہ اور اس قسم کی دوسری خصوصیات جن کا غالب کے ذہن و مذاق سے براہ راست واسطہ ہے، ہم کو یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں کہ غالب کے پاس ایک ایسا ذہنی شعور تھا جو ان سے پہلے کسی شاعر یا ادیب کے یہاں کم نظر آتا ہے۔ اگر تھا بھی تو ان میں سے کسی نے نثر میں نمایاں کرنے کی زحمت نہیں کی۔

ہم اس سے بے خبر نہیں کہ لوگوں نے تذکروں میں شعرا کی خصوصیات کلام پر تبصرہ کیا ہے مگر شعر کی وجدانی یا رسمی تعریف سے زیادہ آگے بات نہیں بڑھتی۔ عموماً صفائی، چستی، گرمی کلام تک بات ہوتی ہے۔ رائے دینے کے وقت ذاتی تعلقات بھی تذکرہ نویسوں کے پیش نظر رہے۔

ان کا ذہن بے لوث معلوم ہوتا ہے نہ پسندیدگی و ناپسندیدگی کی واضح و منطقی وجہ بتائی جاتی ہے۔ وجدانی کیفیت اصول بن کر سامنے نہیں آتی، کامیاب یا عظیم تخلیق کے سلسلہ میں شاید ہی کسی نے نثر میں ایسی خصوصیات کا ذکر کیا ہو جن کے ہونے یا نہ ہونے سے فن یا شعر بلندی یا پستی سے ہمکنار ہوتا ہے۔ غالب نے جابجا اپنے ایسے خیالات کو ضبط تحریر میں لانے کی ابتدا کر کے دوسروں کے ذہن کو بڑی خوبصورتی سے بیدار کرنے کی فکر کی۔ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے اس فن میں کہیں کوئی سیر حاصل بحث نہیں کی مگر جس طرح بات کہی ہے وہ غالباً زیادہ وضاحت کی محتاج بھی نہیں۔

ایک خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:

"کیا ہنسی آتی ہے کہ تم مانند اور شاعروں کے مجھ کو بھی یہ سمجھتے ہو کہ استاد

کی غزل یا قصیدہ سامنے رکھ لیا یا اس کے قوافی لکھ لیے اور ان قافیوں پر لفظ جوڑنے لگے ۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ ۔ بچپن میں جب سے میں ریختہ لکھنے لگا ہوں لعنت ہے مجھ پر اگر میں نے کوئی ریختہ یا اس کے قوافی پیش نظر رکھ لیے ہوں .... بھائی شاعری معنی آفرینی ہے ، قافیہ پیمائی نہیں "۔

اس اقتباس سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ غالب ان شعرا کو کسی وقعت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے جو صرف قافیہ کے بل بوتے پر شاعری کیا کرتے ہیں جن کو قافیہ مضمون سوچنے پر مائل کرتا ہے ۔ جن کے پاس مشاہدہ کی انفرادیت ہے نہ تخیل کا سرمایہ ، وہ خالی الذہن ہیں ۔ قافیہ ، ردیف سے مل کر حسب استعداد کسی بات کی طرف لے جاتا ہے اور بات شعر کے سانچے میں ڈھل کر صفحہ قرطاس پر آجاتی ہے ۔ اس لیے یہاں جامع عبارت میں غالب نے کہہ دیا کہ " شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں " یعنی ضرورت اس بات کی ہے کہ شاعر بناتے فکر میں ایسے مضمون کی تلاش کرے جو خیالات کی ندرت دگرمی سے شعر کو قابل توجہ بنا دے ۔ اگر یہ خصوصیت نہیں ہے تو شاعری قافیہ پیمائی کے مترادف ہے ۔ غالب کا یہ سوچنا اور اتنی بنیادی بات کا اس طرح پیش کرنا ہمیں یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ عجب نہیں کہ مقدمہ شعر و شاعری میں معنی و خیال کی بحث اسی تعلیم و اشارہ کی بنیاد پر قائم ہوئی ہو ۔ جب حالی یہ کہتے ہیں کہ " سب سے مقدم اور ضروری چیز جو کہ شاعر کو غیر شاعر سے تمیز دیتی ہے ، قوت متخیلہ ہے یا تخیل ہے جس کو انگریزی میں " امیجنیشن " کہتے ہیں ۔ یہ قوت شاعر میں جس قدر اعلیٰ درجہ کی ہوگی اسی قدر اس کی شاعری اعلیٰ درجہ کی ہوگی اور جس قدر ادنیٰ درجہ کی ہوگی اسی قدر اس کی شاعری ادنیٰ درجہ کی ہوگی " ۔ تو ہم کو غالب کا یہ مقولہ یاد آتا ہے کہ شاعری معنی آفرینی ہے ، قافیہ پیمائی نہیں ۔ کیونکہ معنی آفرینی بغیر تخیل کی بلند پروازی کے ممکن نہیں ۔ اور غالب کا منشا بھی یہی معلوم ہوتا ہے ۔ جس کو شاعری کی بنیاد سمجھ کر غالب نے عمر بھر خامہ فرسائی کی ۔

غالب کے تنقیدی شعور نے طائر فکر کو خلا میں بے قید و بند نہیں چھوڑا ۔ وہ خیال کی بنیاد کسی حقیقت پر چاہتے ہیں ۔ خیالی اور فرضی باتوں سے بجائے بلندی تخیل

کے بازی گری کا اظہار ہوتا ہے۔ جو نہ شاعری کا مقصد ہے اور نہ کسی مفید مطلب کا باعث۔ شاعری علم و حکمت کے ادراک کا نام ہے اس لیے ضروری ہے کہ ذہن انسانی کے فروغ کے لیے کوئی ایسی بات کہی جائے جو حقیقت و عمل کا پر تو لیے ہو، جس امر پر روشنی ڈالی گئی ہو، جو مسئلہ زیر غور ہو اس میں استدلال کی گنجائش ہو۔ خیالات و فن کو اہم بنانے کے لیے غالب نے اس بات پر کافی زور دیا ہے اور اس کا اقرار کیا ہے کہ "پندرہ برس کی عمر سے ۲۵ برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں ایک بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا۔ اوراق یک قلم چاک کیے۔" یہ اقتباس اس خط کا ہے جو مرزا غالب نے عبدالرزاق شاکر کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "بندہ ابتدائے فکر سخن میں بیدل و اسیر و شوکت کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا۔" بعد میں اس طرز تخیل کو غالب نے اتنا حقیر و بیہودہ سمجھا کہ اپنے آپ کو بھی معاف نہ کیا، اوراق دیوان چاک کر دیتے اور اس دیوان کو دور کیا جو اب تک جمع ہو گیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں غالب یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں کہ یہ خیالی و فرضی باتیں ویسی ہی بے مایہ ہیں جیسی بچوں کی سوجھ بوجھ یعنی طفلانہ بازی گری سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ جب تک تمیز نہ تھی بیدل وغیرہ کی لفاظی بڑی وقیع معلوم ہوتی لیکن جب شعور بالغ ہوا تو محسوس ہوا کہ یہ اقدام شاعری کے لیے نہ صرف غیر مفید ہے بلکہ مہلک ہے۔ اس فضا سے صرف طائر لاہوتی کی پرواز میں کمی نہیں آتی بلکہ اس کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ اگر یہ رویہ قائم رہ جاتے تو شاعری و نظر بندی میں کوئی فرق نہ رہ جاتے گا۔ شاعر تلمیذ الرحمٰن ہونے کے بجائے کسی شعبدہ گر کا آلہ کار معلوم ہو گا۔ کسی خیال کو اگر منطق کی کسوٹی پر پرکھا نہیں جا سکتا تو وہ بھی قابل اعتنا نہیں۔ اس کا اشارہ وہ ایک تحریر میں اس طرح کرتے ہیں کہ فن کے فروغ کے لیے بظاہر اس میں عمومیت نہیں معلوم ہوتی مگر غور کرنے پر یہ نتیجہ نکلتا ہے۔ مفتی میر عباس سے ایک خط میں اپنی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فارسی کے ساتھ ایک مناسبت ازلی و سرمدی لایا ہوں۔ مطابق اہل پارس کے منطق کا بھی مزہ ابدی لایا ہوں۔"

غالب کو اپنی فارسی دانی پر ناز ہے اور اس نازش کی خاص وجہ یہ ہے کہ ان کا منطق

شعوران کا ابدی راہ بر ہے۔ اس میں یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ خیالات قلم بند کرنے میں اس کا لحاظ رکھنا لازمی ہے کہ مسئلہ یا گفتگو صرف جذبات یا الفاظ کا سہارا لے کر اگر نظم کیے جائیں گے تو اثر وہ سرپا نہ ہو گا۔ بات اسی وقت پر اثر اور دلنشین ہو سکتی ہے جب اس کو دلیل و حقیقت کی روشنی میں پیش کیا جائے۔ عقل و فہم کے لیے اختلاف و اتفاق کے راستے کھلے ہوں۔ اگر کسی مسئلہ پر منطقی انداز سے گفتگو نہیں ہو سکتی تو راہ غور و فکر مسدود ہو جائے گی اور مسئلہ غیر اہم ہو جائے گا۔

غالب کا منطقی شعور صرف نظریاتی نہ تھا بلکہ عملی بھی تھا۔ اس کا ثبوت ہم کو اس وقت ملتا ہے جب وہ اپنے اشعار کی تشریح کرنے کے لیے قلم اٹھاتے ہیں۔ مثال کے لیے ان کے سمجھانے کا انداز حسب ذیل شعر کی وضاحت میں ملاحظہ ہو۔

"اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے
ظلمت کدہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے

لکھتے ہیں: "اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے"۔ یہ خبر ہے۔ دوسرا مصرع ظُلمت کدہ میں میرے شب غم کا جوش ہے" یہ مبتدا ہے۔ شب غم کا جوش یعنی اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ ظلمت غلیظ سحر ناپیدا گویا خلق ہی نہیں ہوتی۔ ہاں دلیل صبح کی نور پہ ہے۔ بجھی ہوئی شمع اس راہ سے کہ شمع و چراغ صبح کو بجھ جایا کرتے ہیں، لطف اس مضمون کا یہ ہے کہ جس شے کو دلیل صبح ٹھہرایا وہ خود ایک سبب ہے منجملہ اسباب تاریکی کے۔ پس دیکھنا چاہیے کہ جس گھر میں علامت صبح موید ظلمت ہو گی وہ گھر کتنا تاریک ہو گا۔"

کسی ادب پر رائے زنی کرنے والے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ وہ اس مخصوص زبان کی نشو و نما سے اس کے مزاج اور ماحول کے مذاق سے پوری طرح واقف ہو۔ اگر ان اوصاف سے بے بہرہ ہے تو اس کی رائے ناقص ہی رہے گی، خواہ وہ کتنا ہی فلسفہ داں مورخ یا عالم ہو۔ وہ الفاظ کے معنی مفہوم صرف لغات کی عینک سے دیکھے گا۔ معاشرہ کے رسم و رواج سے بیگانگی فنکار کی باتوں کی تہ تک نہ پہونچنے دے گی۔ مثلاً اگر کوئی شخص آشیاں کے معنی صرف گھونسلا جانتا ہے یا گل کے معنی صرف گلاب

کا پھول سمجھتا ہے یا غبار کو صرف گرد یا دھواں خیال کرتا ہے تو وہ اردو شاعری کے باطن سے ناآشنا رہے گا۔ ایسا شخص اگر ہماری شاعری پر ریویو کرتا ہے تو ممکن ہے غصہ نہ آئے مگر یہ ضرور کہنا پڑے گا کہ:

"سخن شناس نہ ای دلبرا خطا اینجاست"

غالب کو اس کا پورا احساس ہے، بہ حیثیت شاعر نہیں بلکہ صاحبِ شعور ہونے کے لحاظ سے جب ہم ان کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ راز آشکارا ہو جاتا ہے۔ ایک خط میں تفتہ کو لکھتے ہیں:

"نیم گناہ، نیم نگاہ، نیم نازیہ روزمرہ اہل زبان ہے۔ نیم بہ معنی اندک ورنہ گناہ آدھا اور نگاہ آدھی اور ناز آدھا مہملات میں ہے، چیزوں کا مناصفہ کیا....."

اگر نیم کے معنی صرف نصف کے لیے جائیں جو عموماً لغات میں ملتے ہیں تو یہ فقرے مہملات کے سوا اور کیا سمجھے جا سکتے ہیں۔ غالب نے جرأت سے کام لے کر کہہ دیا کہ یہ روزمرہ اہل زبان ہے۔ ان کے کہنے کا صاف مطلب یہ ہے کہ لغات میں چاہے "نیم" کے معنی صرف نصف ہی لکھا ہو مگر اہلِ زبان اسے "اندک" یعنی کچھ یا تھوڑے کے مفہوم میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے ایسے موقع پر ہم لغات کو پس پشت ڈال کر اہل زبان کی طرف نظر کریں گے۔ جن مفہوم میں جمہور نے استعمال کیا ہے وہ سب ہم کو ماننا چاہیے۔ خواہ گرامر اور لغات خاموش ہی کیوں نہ ہوں۔

اس بات کے متعلق کہ جہاں لغات و گرامر خاموش ہوں وہاں الجھن دور کرنے کے لیے تجربہ کار اہل زبان کی طرف رجوع کرنا چاہیے، غالب نے ایک اور موقع پر اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک بعض مقامات پر اہلِ زبان لغت و گرامر سے زیادہ اہم و کارآمد ہوتے ہیں۔ دیکھنے میں تو یہ معمولی بات ہے مگر ذہن کی دوررسی کا وہ سراغ اس بات سے ملتا ہے جو یہ محسوس کراتا ہے کہ لغت قواعد ضوابط زبان کے لیے حرف آخر نہیں بلکہ وہ ہستیاں ہیں جنھوں نے شعوری و غیر شعوری طور پر زبان و سماج کے مزاج و مذاق سے متاثر ہو کر الفاظ و فقرات میں وہ معنی پہنائے جو محسوسات و خیالات کی پوری ترجمانی کر سکیں۔ قطع نظر اس کے کہ

وہ لغات میں ہیں یا نہیں، گرامر کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں یا نہیں۔ اس ضمن میں مرزا رحیم بیگ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"تو نے سنا نہیں جو عرفی اور فیضی میں گفتگو ہوئی۔ لغات فارسی اور ترکیب الفاظ میں کلام تھا۔ مولانا جمال الدین عرفی رحمتہ اللہ علیہ نے کہا کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا اور نطق آشنا ہوگیا ہوں، اپنے گھر کی بوڑھیوں سے لغات فارسی اور یہی ترکیبیں سنتا رہا ہوں۔ فیضی بولا کہ جو کچھ تم نے گھر کی بوڑھیوں سے سیکھا ہے وہ ہم نے خاقانی اور انوری سے اخذ کیا ہے۔ حضرت عرفی نے فرمایا تقصیر معاف خاقانی و انوری کا ماخذ گھر کی پیر زالوں کا کلام ہے۔ ہائے اہل تمیز کہاں سے لاؤں جو دیکھیں کہ یہ حال قلم رو ہند کے صاحب کمالوں کا ہے۔"

اس خیال کی مزید وضاحت ہم کو غالب کی ایک دوسری تحریر میں بھی ملتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں میں بعض الفاظ کے تذکیر و تانیث پر بحث تھی، اس مسئلہ کو قدر بلگرامی نے مرزا غالب کی خدمت میں پیش کر کے فیصلہ کی درخواست کی۔ مرزا غالب نے جواب میں تحریر فرمایا کہ:

"فقیر کے نزدیک نقاب، قلم، دہی مذکر ہیں۔ فارسی میں تانیث و تذکیر کہاں؟ پس اس امر کے مالک اور اہل زبان ہم ہیں..... یعنی ہم اور تم اور مجموع شرفاء شعرائے دہلی و لکھنؤ۔ ایسے دس آدمی کا اتفاق سند ہے، زیادہ جھگڑا بے فائدہ۔"

اس عبارت سے صرف یہی نہیں معلوم ہوتا کہ اہلِ زبان لغات اور قواعد سے بالاتر ہیں بلکہ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ غالب یہ سمجھتے تھے کہ زبان کی نشوونما کسی ایک گروہ سے وابستہ نہیں۔ اس کا تعلق جمہور سے ہے، ایک دو آدمی سے نہیں؛ شرفاء شعرا کی قید لگا کر غالب نے یہ بھی بتا دیا کہ کون لوگ اس کے اہل ہیں اور کن کی زبان مستند سمجھی جاسکتی ہے، کس طبقہ کا فیصلہ قابلِ قبول ہوسکتا ہے۔

تنقید کے لیے جرأت رندانہ وہ ضروری خصوصیت ہے جس کے بغیر انفرادیت و شخصیت کا نمایاں ہونا دشوار ہے۔ یہ عنصر جس حسن و شدت کے ساتھ آتا ہے اتنا ہی ناقد

میز وممتاز ہونے کی امید کرسکتا ہے۔ اسی جرأت کا تقاضا ہوتا ہے کہ ادیب اپنی قوت تخیل کو کسی عصبیت یا شخصیت سے مرعوب نہ ہونے دے۔ نہ اس بات سے اپنی فکر مجروح ہونے دے کہ فلاں شخص مسلم الثبوت استاد ہے۔ اس کی ہر بات صحیح ہوگی، وہ شخص غلطی نہیں کرسکتا۔ یا یہ سوچ کر دریدہ دہن ہو جائے کہ کوئی شاعر یا ادیب اس کا ہم مذاق یا ہم خیال نہیں۔ اس لیے اس کی عیب جوئی فرض ہو گئی ہے۔ یہ جرأت دلیل و منطق کے علاوہ علمیت کے ساتھ ساتھ حقیقت پسندی کا بھی مطالبہ کرتی ہے۔ غالب کے یہاں یہ خصوصیت کافی ہے۔ یہاں ہم ان کی اس جرأت رندانہ کا ذکر نہیں کرنا چاہتے جو میدانِ نظم میں ہر طرف بکھری پڑی ہے۔ اس لیے کہ اس پر تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ تعلی شاعرانہ انداز فکر کا نتیجہ ہے۔ شاعروں کے لیے یہ ایک رسمی روایتی بات ہو گئی تھی۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں مگر اس وقت اس پر بحث بھی مقصود نہیں۔ یہاں ہم ان کی وہ باتیں یا رائیں پیش کرنا چاہتے ہیں جو نثر میں ملتی ہیں، جن پر روایتی یا شعری خصوصیات کی پرچھائیاں ہونے کا شبہ نہیں ہو سکتا۔ ان عبارتوں کی متانت و سنجیدگی ذہن کو کسی بہلانے کی طرف نہیں لے جا سکتی۔ بعض تاریخی واقعات بھی ہماری تائید کرتے ہیں مثلاً اس واقعہ کو یاد کر لیجیے جب غدر کے بعد برہان قاطع پر رائے زنی کر کے غالب نے ایک دنیا کو اپنے خلاف کر لیا تھا۔ مخالفین کا ہر طرف سے یلغار تھا۔ مگر غالب پھر بھی اپنی راستے پر قائم رہے۔ ان کو اس کا بالکل ڈر نہ ہوا کہ اس لغت نویس کے ہزارہا مقلد ہیں۔ اور مقلدین کی علمی بنیاد اسی لغت پر قائم ہے۔ وہ ان الفاظ کے معنی وغیرہ پر رائے زنی و نکتہ چینی میں ہمیشہ بے باک رہے جو ان کے نزدیک غلط اور گمراہ کن تھے۔ اس لغت کے مرتب کرنے والوں کو غالب نے جی کھول کر برا بھلا کہا۔ اس کی لغزشوں کو نمایاں کر کے اسے رسوائے عام کر دیا۔ یہ تو ایک ایسی بات ہے جو محتاج بیان نہیں۔ مگر اس سلسلہ میں انہوں نے جس طرح بے باک ہو کر جملہ لغت نویسوں کی قلعی اتاری ہے وہ قابل ذکر ہے، ان ہی کی زبان سے سنیے:

رحیم بیگ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

”یہ تو جانو کہ غالب سوختہ اختر کا فرہنگ نویسوں کے بارے میں کیا عقیدہ ہے۔ اگرچہ قاطع برہان میں جا بجا لکھتا آیا ہوں مگر اب ہندی کی چندی کر کے

لکھتا ہوں کہ یہ میرا عقیدہ ہے کہ فرہنگ لکھنے والے جتنے گزرے ہیں سب ہندی نژاد ہیں۔ ہاں علم صرف و نحو عربی میں بقدر تحصیل مسلم اور استاد ہیں۔ علم صرف و نحو کی کتب درسی موجود ہیں۔ جس نے چاہا اس نے استاد سے ان کتب کو پڑھ لیا ہے۔ فارسی کی جو فرہنگیں حضرت نے لکھی ہیں، مطالب مندرجہ کس اصول پر منضبط کیے ہیں اور اس کا علم کس استاد سے حاصل کیا ہے؟ قواعد فارسی کا رسالہ اہل زبان میں سے کس نے لکھا ہے اور ان ہوس پیشہ فرہنگ لکھنے والوں نے وہ رسالہ کس فاضل عجم سے پڑھا ہے؟"

اس خط میں کچھ آگے بڑھ کر مکتوب الیہ کو مخاطب کرتے ہوتے لکھتے ہیں :-

"ایک لطیفہ لکھتا ہوں اگر خفا نہ ہو جاؤ گے تو حظ اٹھاؤ گے جتنی فرہنگیں اور جتنے فرہنگ طراز ہیں یہ سب کتابیں اور جامع مانند پیاز ہیں۔ تہہ بہ تہہ اور لباس در لباس۔ وہم در وہم اور قیاس در قیاس ـــ پیاز کے چھلکے جس قدر اتارتے جاؤ گے، چھلکوں کا ڈھیر لگ جاتے گا مغز نہ پاؤ گے۔ فرہنگ لکھنے والوں کے پردے کھولتے جاؤ، لباس ہی لباس دیکھو گے شخص معدوم۔ فرہنگ کی ورق گردانی کرتے رہو، ورق ہی ورق نظر آئیں گے معنی موہوم۔ ظرافت پر مدار تحقیق نہیں ہے۔ آپ کے خاطر نشین کرتا ہوں جو میرے دل نشین ہے فرہنگ نویسوں کا قیاس معنی فارسی میں نہ سراسر غلط ہے البتہ کمتر صحیح اور بیشتر غلط ہے۔"

اس اقتباس میں جو بے باکی اور دلیل آپ نے مرزا سے سنی وہ علاوہ حسن بیان کے حقیقت پر مبنی ہے جن لوگوں نے لغات کا مطالعہ و موازنہ کیا ہو گا وہ مرزا غالب کی راتے سے متفق ہوں گے کہ واقعی فرہنگ طرازوں نے تحقیق میں بڑی کوتاہی کی ہے۔ عقل سے کم کام لیا ہے، نقل سے زیادہ۔ اس تحریر میں جرأت کے ساتھ ساتھ متانت اور اصابت راتے بھی قابلِ احترام ہے، اور ہمارے نزدیک تنقید نگاری کی اولین شرط بھی ہے۔

میں نے اوپر بھی ذکر کیا ہے کہ مرزا غالب کورانہ تقلید کے سخت خلاف تھے۔ اور اس بات سے مرعوب بھی نہ تھے کہ اگلے زمانے میں کسی مشہور استاد نے چونکہ یہ بات

لکھ دی ہے لہٰذا اس کی قدامت واستادی کے سامنے بے چون وچرا سر جھکا لیا جاتے۔ ان کا قول تھا کہ:

"یہ نہ سمجھا کرو کہ اگلے جو کچھ لکھ گئے ہیں وہ حق ہے۔ کیا آگے آدمی احمق نہیں ہوتے تھے۔"

پھر ایک خط میں منشی ہر گوپال تفتہ کو لکھتے ہیں:

"لفظ شگفتن اور گوش شگفتن ہم نہیں جانتے۔ اگرچہ منشی ہر گوپال تفتہ اور مولانا نور الدین ظہوری نے لکھا ہو۔"

اس انداز بیان کا تیور صاف بتا رہا ہے کہ اگر غلطی ظہوری سے بھی ہوئی ہو تو ماننا ضروری نہیں۔ بزرگوں کی غلطی پر آمنا وصدقنا نہ کہنے کی ایک مثال یہ بھی قابل ذکر ہے۔

ایک خط میں چودھری عبدالغفور کو غالب لکھتے ہیں کہ:

"وارستہ سیال کوٹی نے خان آرزو کی تحقیق پر سو جگہ اعتراض کیا ہے اور ہر اعتراض بجا ہے۔"

مرزا غالب کے تنقیدی شعور کا ایک پہلو یہ بھی قابلِ قدر ہے کہ وہ اپنی غلطی تسلیم کرنے میں تکلف نہیں کرتے۔ اس کو ان کی ادبی ایمانداری سمجھیں یا بڑاپن سے خیال کریں، بہر حال قابل قدر خصوصیت ہے۔ مثال کے لیے ایک موقع ملاحظہ ہو۔ مرزا رحیم بیگ کو ایک خط لکھتے ہوتے اعتراف سہو کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

"آویزہ وافسوس کے بیان میں مجھ سے وہ سہو ہوا ہے کہ مجھے اس کا اقرار اور میرا دوست میاں داد خاں شرمسار ہے۔"

اسی طرح ایک دوسرے خط میں انہی بزرگ کو مخاطب کر کے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں، کہتے ہیں:

"بھائی تمہارے ذہن نے خوب انتقال کیا۔ میں نے جس وقت یہ شعر پڑھا، نہ ہند آمدندے زایراں دیار۔ آمدند کی جگہ آمدندے بہ صیغہ استمرار ٹکسال باہر معلوم ہوا۔ "رسیدند در ہند زایراں دیار" اس کی جگہ لکھ دیا۔ واقعی پوستین کا بیچنا راہ میں واقع ہوا۔ پھر رسیدند در ہند بیجا، تمہارا تصرف مستحسن۔ جس طرح تم نے لکھا ہے اسی طرح رہنے دو۔"

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ باوجود غور و خوض کے مجھے یہ صحیح اندازہ نہیں ہو سکا کہ مرزا غالب ادبی لحاظ سے فصاحت کے زیادہ دل دادہ تھے یا بلاغت کے گرویدہ تھے۔ اس کا فیصلہ دراصل آسان بھی نہیں، اس لیے کہ فصاحت و بلاغت کی حدیں ایسی ملی ہوئی ہیں کہ ان کا ایک دوسرے سے جدا کرنا گوشت سے ناخن الگ کرنا ہے۔ عرف عام میں جو مفہوم فصاحت و بلاغت کا سمجھا گیا ہے وہ ہمیشہ زیر بحث رہا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ان کی پیچیدگی مماثلت و مغائرت کی وجہ سے اتنی زیادہ ہو گئی ہے کہ آسانی سے جامع و مانع ادبی تخصیص ہو بھی نہیں سکتی۔ لیکن پھر بھی ذہن میں جو ایک نقشہ ان دونوں صفات کا ہے اس کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو مرزا غالب کبھی فصاحت پر زور دیتے ہیں کبھی بلاغت پر۔ بایں ہمہ میری رائے میں ان کی پسندیدگی کی میزان میں فصاحت کا پلہ گراں نظر آتا ہے۔ طرز ادا میں وہ ان ہی شعرا کے زیادہ قائل نظر آتے ہیں جو زبان کے اعتبار سے صاف اور پُرمعنی اشعار کہتے ہیں۔ ایک خط میں سعدالدین شفق کو لکھتے ہیں:-

"رودکی، اسدی، فردوسی کا شیوہ سعدی کے وقت میں ترک ہوا اور سعدی کے طرز نے بہ سبب سہل ممتنع ہونے کے رواج نہ پایا۔ اس میں نئے نئے رنگ پیدا ہوتے گئے تو اب طرزیں تین ٹھہریں۔۔۔ ممتاز و اختر وغیرہم کا کلام، ان تینوں طرزوں میں سے کس طرز پر ہے بے شبہ فرماؤ گے کہ یہ طرز ادا ہی ہے۔۔۔۔ کیا کہنا ہے۔ خوب طرز ہے، اچھی طرز ہے مگر فارسی نہیں ہندی ہے۔ دارالضرب شاہی کا سکہ نہیں ہے ٹکسال باہر ہے۔ داد، داد اصناف اصناف۔ وہ چیز نہ حصے میں سب پارسیوں کے آئی ہے۔ ہاں اردو زبان میں بعض اہل ہند نے بھی وہ چیز پائی ہے۔

میر تقی علیہ الرحمۃ

بدنام ہو گے جانے بھی دو امتحاں کو
رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جاں کو

سودا

دکھلائیے لے جا کے تجھے مصر کا بازار
خواہاں نہیں لیکن کوئی واں جنس گراں کا

مومن ؛ تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ناسخ کے یہاں کم تر آتش کے یہاں بیش تر یہ نشتر ہیں۔"

ان باتوں سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ فصاحت کلام کو بہ نسبت بلاغت کے زیادہ مرغوب رکھتے تھے۔ مگر بعض مقامات ان کی تحریروں میں ایسے بھی نظر آتے ہیں جن سے خیال ہوتا ہے کہ مرزا غالب کو بلاغت زیادہ پسند تھی۔ مثال کے لیے اس خط کی عبارت ملاحظہ ہو جو انہوں نے منشی ہر گوپال تفتہ کو لکھا تھا۔ اپنے اس شعر کی تشریح کرتے ہیں ؛

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

لکھتے ہیں ؛

"یعنی اب جو دور مجھ تک آیا ہے تو میں ڈرتا ہوں، یہ جملہ سارا مقدر ہے۔ میرا فارسی کا دیوان جو دیکھے گا وہ جانے گا کہ جملے کے جملے مقدر چھوڑ جاتا ہوں۔ ہر سخن وقتے و ہر نکتہ مقامے دارد۔"

معنی و بیان جاننے والے جانتے ہیں کسی ایسے پہلو کو محذوف یا مقدر کر دینا جو مفہوم میں تازگی پیدا کر سکے۔ بلاغت کا خاص جزو ہے۔ غالب کے یہاں اس حسنِ بیان کے نمونے بہت ہیں۔

ایسا نہیں کہ مقدر اتفاقی ہو۔ ان کے دیوان میں ایسے اشعار کافی ہیں جن میں یہ صفت پائی جاتی ہے۔ ان باتوں سے شک ہوتا ہے کہ ذہنی طور پر وہ بلاغت کے دل دادہ تھے۔ لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آخر عمر میں مرزا صاحب نے ایسے اشعار پر زیادہ توجہ کی جو آسان اور طرزِ بیان کی دلکشی کے اعلیٰ نمونے ہیں، اور نثر میں بھی انہوں نے خط نویسی کی بنیاد سہل الفاظ، مروجہ روزمرہ رواں دواں عبارت پر قائم کی تو قیاس یقین کے قریب ہو جاتا ہے اور کہنا پڑتا ہے کہ غالب کو بلاغت سے زیادہ فصاحت مرغوب تھی۔ حالانکہ ان کی فارسی اور اردو شاعری میں اشارت، کنایت اور مقتضائے حال کے موافق بات کہنے کو وہ اہمیت حاصل ہے جس نے انہیں

دوسرے شعرا میں ممتاز کر دیا ہے۔

بہر حال غالب کے تنقیدی شعور کی جو جھلکیاں ان کے خطوط میں نظر آتی ہیں ان کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہیں ہو سکتا کہ وہ نہ صرف زبان اور لغت کی صحت محاورے اور روزمرہ کے مناسب استعمال سے واقف تھے بلکہ ان کی پیچیدگیوں پر بھی نظر رکھتے تھے۔ مواد و ہیئت میں مطابقت کی جستجو کرتے تھے۔ خامیوں اور خوبیوں پر مدلل رائے رکھتے تھے اور اصلاً ہر نقاد یہی کرتا ہے۔

■■

نثار احمد فاروقی

نوادرِ غالب

ایک غیر مطبوعہ خط اور ایک قطعہ

غالب کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور ہنوز دل کاوش کا تقاضا کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اب تک تلاش کرنے والوں کو کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے۔ آج یہاں ان کے ایک فارسی خط اور ایک قطعۂ تاریخ کا متن پیش کرتا ہوں۔

یہ خط سر سید احمد خاں (۱۸۱۷ء – ۱۸۹۸ء) کے نام لکھا گیا ہے۔ اس زمانے میں وہ سر تو نہیں ہوتے تھے، لیکن آخری تاجدار مغلیہ کے دربار سے انہیں "جواد الدولہ سید احمد خاں بہادر عارف جنگ" کا خطاب مرحمت ہو چکا تھا۔ سرکار انگریزی کی ملازمت میں منسلک ہونے کے بعد وہ مین پوری میں بہ حیثیت منصف مقرر ہوئے تھے وہاں سے ۱۰ جنوری ۱۸۴۲ء کو ان کا تبادلہ فتح پور سیکری کے لیے ہوا[1]۔ جہاں وہ چار برس تک منصف رہے۔ ۱۸ فروری ۱۸۴۶ء کو فتح پور سیکری سے دہلی تبدیل ہو گئے۔[2]

اس خط کے عنوان میں سر سید کے منصف فتح پور ہونے کا ذکر ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ۱۸۴۲ء کے بعد لکھا گیا ہے۔ اور سر سید کے برادر بزرگ سید محمد (مالک سید الاخبار دہلی) کا بھی حوالہ ہے جن کا انتقال ۱۸۴۶ء میں ہوا ہے[3]۔ اس طرح اس کا زمانۂ کتابت ۱۸۴۲ء – ۱۸۴۶ء کے مابین قرار پاتا ہے۔

اس خط کی شان نزول بظاہر یہ ہے کہ سر سید احمد خاں نے غالب کو غلام

۱- حالی: حیات جاوید، جلد اوّل – ۱۱۱ (طبع اکادمی پنجاب، لاہور)
۲- ماسبق – ۱۱۳
۳- ایضاً – ۱۱۳

امام شہید[1] کے دو نعتیہ اشعار بھیج کر انہیں تضمین کرنے کی فرمائش کی تھی۔ اس پر غالب نے معذوری ظاہر کی ہے۔ اس کے دو سبب ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ فرمائشی چیزیں لکھنے سے طبعاً گھبراتے تھے۔ دوسرے یہ کہ غلام امام شہید اور ان کی شاعری کے بارے میں غالب کی رائے کبھی اچھی نہیں رہی۔ انہوں نے شہید کے اشعار کی تضمین کو اپنے لیے "دون مرتبت" سمجھا ہوگا۔ تیسرا سبب یہ بھی ہے کہ سرسید سے غالب کے تعلقات کبھی زیادہ مخلصانہ نہیں رہے۔ اسی خط کے لب و لہجہ سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ جب انہوں نے سرسید کی پہلی تصنیف 'آثار الصنادید' کے لیے تقریظ لکھی (۱۸۴۷ء) تو اس میں نری لفاظی تھی۔ مصنف کتاب کی مدح میں بہت کم تھا۔ بعد ازاں سرسید نے آئین اکبری کی تصحیح کر کے چھپوایا۔ (۱۸۵۲ء – ۱۲۷۲ھ) تو غالب سے اس پر کچھ لکھنے کی فرمائش کی۔ غالب نے ۳۸ شعروں کی ایک مثنوی لکھ ڈالی جو کلیات نظم فارسی میں موجود ہے۔ اسے سرسید نے کتاب میں شامل نہیں کیا۔ بلکہ غالب کے پاس واپس کر دیا اور لکھا کہ ایسی تقریظ مجھے درکار نہیں۔ کیونکہ اس میں غالب نے ابوالفضل اور آئین اکبری کے بارے میں اچھی رائے ظاہر نہیں کی تھی، اور سرسید کو مشورہ دیا تھا کہ ان گڑے مُردوں کو اکھاڑنے کے بجائے اہلِ فرنگ کی نئی ایجادیں اور سائنس کی برکتیں ملاحظہ کریں تو معلوم ہوگا کہ آئین جہانبانی اسے کہتے ہیں اور آئین اکبری تقویم پارینہ ہو چکا ہے۔ چند اشعار اس مثنوی[2] کے ملاحظہ ہوں:

وینکہ در تصحیح آئین رائے اوست
ننگ دعا رہمت والائے اوست
برچنیں کارے کہ اصلش ایں بود
آں ستاید کش ریا آئیں بود
من کہ آئین ریا را دشمنم
در دفا اندازہ داں خود منم

۱– الہ آباد کے باشندے تھے۔ ۷۵ سال کی عمر میں ۲ اکتوبر ۱۸۷۹ء کو وہیں انتقال کیا۔ شہید کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ (نادر روزنامچہ – ۳۱)

۲– کلیات نظم غالب – ۱۰۹ (طبع نولکشور – ۱۹۲۴ء)

گر بدیں کارش نگویم آفریں
جاے آں دارد کہ جویم آفریں
باید آئینان نمانم در سخن
کس نداند انچہ دانم در سخن
گر نہ آئیں می رود با ما سخن
چشم بکشا اندریں دیر کہن
صاحبان انگلستان را نگر
شیوہ و انداز اینان را نگر
تاچہ آئیں ہا پدید آوردہ اند
آنچہ ہرگز کس ندید آوردہ اند
زیں ہنرمند ہنر بیشی گرفت
سعی بر پیشینیان پیشی گرفت
حق ایں قوم ست آئیں داشتن
کس نیارد ملک بہ زیں داشتن
داد و دانش را بہم پیوستہ اند
ہند را صد گونہ آئیں بستہ اند
آتشے کس سنگ بیروں آورند
ایں ہنرمنداں ز خس چوں آورند
تاچہ افسوں خواندہ اندانیاں بر آب
دود کشتی را ہمی راند در آب
گہ دخاں کشتی بہ جیحوں می برد
گہ دخاں گردوں بہ ہاموں می برد
غلطک گردوں بگرداند دخاں
نرہ گاو اسپ را ماند دخاں

از دخاں زورق برفتار آمده
باد و موج ایں ہر دو بیکار آمده
نغمہ ہا بے زخمہ از ساز آورند
حرف چوں طائر بہ پرواز آورند
ایں نمی بینی کہ ایں دانا گروه
درد و دم آرند حرف از صد گروه
می زنند آتش بباد اندر ہمیں
می درخشند باد چوں اخگر ہمیں
رو بہ لندن کندراں رخشنده باغ
شہر روشن گشتہ در شب بے چراغ
پیش ایں آئیں کہ دارد روزگار
گشتہ آئین دگر تقویم پار
مرده پروردن مبارک کار نیست
خود بگو کاں نیز جز گفتار نیست

معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعے کے بعد رنجش پیدا ہو گئی۔ تا آنکہ جب جنوری ۱۸۶۶ئہ میں غالب رامپور گئے تو واپسی میں مراد آباد کی ایک سرائے میں اترے۔ اس زمانے میں سید احمد خاں صدر الصدور تھے۔ انہوں نے جو مرزا کے آنے کا حال سنا تو اصرار کر کے اپنے مکان پر لے گئے۔ مولانا حالی نے اس کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے۔

"سر سید کہتے تھے کہ جب میں مراد آباد میں تھا اس وقت مرزا صاحب نواب یوسف علی خاں صاحب مرحوم سے ملنے کو رامپور گئے تھے۔ ان کے جانے کی تو مجھ کو خبر نہیں ہوئی، مگر جب دلّی کو واپس جاتے تھے، میں نے سنا کہ وہ مراد آباد میں سرائے میں ٹھہرے ہیں۔ میں سرائے میں پہنچا اور مرزا صاحب کو اسباب اور تمام ہمراہیوں کے ساتھ اپنے مکان میں لے آیا۔ ظاہرا جب سے سر سید نے تقریظ کے چھاپنے سے انکار کیا تھا وہ مرزا سے اور مرزا ان سے نہیں ملے تھے اور دونوں کو حجاب دامن گیر ہو گیا تھا اور اسی لیے مرزا نے مراد آباد میں

آنے کی ان کو اطلاع نہیں دی تھی۔ الغرض جب مرزا سرائے سے سرسید
کے مکان پر پہنچے اور پالکی سے اترے تو ایک بوتل ان کے ہاتھ میں تھی۔
انہوں نے اس کو مکان میں لاکر ایسے موقع پر رکھ دیا جہاں ہر ایک آتے
جاتے کی نگاہ پڑتی تھی۔ سرسید نے کسی وقت اس کو وہاں سے اٹھا کر
اسباب کی کوٹھری میں رکھ دیا۔ مرزا نے جب بوتل کو وہاں نہ پایا تو بہت
گھبرائے۔ سرسید نے کہا "آپ خاطر جمع رکھیے، میں نے اس کو بہت احتیاط
سے رکھ دیا ہے۔" مرزا صاحب نے کہا بھئی مجھے دکھا دو تم نے کہاں رکھی ہے
انہوں نے کوٹھری میں لے جا کر بوتل دکھا دی۔ آپ نے اپنے ہاتھ سے بوتل
اٹھا کر دیکھی اور مسکرا کر کہنے لگے کہ بھئی اس میں تو کچھ خیانت ہوئی ہے۔ سچ
بتاؤ کس نے پی ہے۔ شاید اسی لیے تم نے کوٹھری میں لاکر رکھی تھی۔ حافظ نے
سچ کہا ہے:

واعظاں کیں جلوہ برمحراب و منبر می کنند
چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند

سرسید ہنس کے چپ ہو رہے اور اس طرح وہ رکاوٹ جو کئی برس سے چلی
آتی تھی رفع ہو گئی۔ مرزا دو ایک دن وہاں ٹھہر کر دہلی چلے آئے۔ [1]

حالی نے "دو ایک دن" ٹھہرنے کا ذکر کیا ہے لیکن غالب پانچ دن تک سرسید
کے مہمان رہے تھے۔ تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔ [2]

"لو صاحب کھچڑی کھائی۔ دن بہلاتے کپڑے پھاڑے گھر کو آئے۔" ۸ جنوری
ماہ و سال حال دو شنبہ کے دن غضب الٰہی کی طرح اپنے گھر پر نازل ہوا۔ تمہارا
خط مضامین دردناک سے بھرا ہوا رامپور میں میں نے پایا، جواب لکھنے کی
فرصت نہ ملی۔ بعد روانگی کے مرادآباد میں پہنچ کر بیمار ہو گیا۔ پانچ دن صدر الصدور
صاحب کے ہاں پڑا رہا۔ انہوں نے تیمارداری اور غمخواری بہت کی۔"

---

[1] حالی: حیات جاوید جلد اول — ۱۲۵ (حاشیہ)
[2] مہر: خطوط غالب — ۲۱۴

دوسرے خط میں سید احمد حسن مودودی کو لکھا ہے۔[1]

"رام پور کی سرکار کا فقیر تکیہ دار روزینہ خوار ہوں۔ رئیس حال نے مسند نشینی کا جشن کیا۔ دعا گوئے دولت کو در دولت پر جانا واجب ہوا۔ ہفتم اکتوبر کو دہلی سے رامپور کو روانہ ہوا۔ بعد قطع منازل ستہ وہاں پہنچا۔ بعد اختتام بزم عازم وطن ہوا۔ ہشتم جنوری کو دہلی پہنچا۔ غرض راہ میں بیمار رہا، پانچ دن مراد آباد میں صاحب فراش رہا۔"

یہ ہے غالب اور سرسید کے تعلقات کی روداد جس کا ہمیں علم ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد بھی تعلقات کبھی رسمی تعلقات سے آگے نہیں بڑھے۔ اس کے ظاہرا دو اسباب ہیں۔ ایک تو سرسید بسلسلہ ملازمت دہلی سے باہر رہے۔ وہ شاعری تفنن طبع سے زیادہ نہ کرتے تھے جو غالب سے خط و کتابت رکھتے۔ دوسرے یہ کہ ۱۸۶۶ء میں صلح صفائی ہوئی اور اس کے تین سال بعد غالب کا انتقال ہو گیا۔

غالب اور غلام امام شہید

مولوی غلام امام شہید سے غالب کیوں برافروختہ تھے۔ اس کا حال نہیں کھلتا۔ ایسا قیاس ہوتا ہے چونکہ وہ محمد حسن قتیل کے شاگرد تھے اور قتیل سے غالب کو خدا واسطے کا بیر تھا اور اوائل عمر میں حامیان قتیل سے ان کا معرکہ کلکتے میں ہو چکا تھا، نیز شہید کے شاگردوں اور مداحوں کا حلقہ وسیع تھا اور وہ اپنے زمانے میں اچھے شاعر و نثر نگار شمار ہوتے تھے۔ پھر حیدر آباد میں ان کی قدر افزائی ہوئی اور نواب محی الدولہ نے انہیں ایک ہزار روپے زادراہ دے کر طلب کیا اور سرکار عالی سے چار سو روپیہ ماہوار مقرر کرا دیئے۔ یہی نہیں بلکہ راجہ گردھاری پرشاد اور محی الدولہ نے زادو راحلہ دے کر انہیں سفر حج کے لیے روانہ کیا۔ اپنے مولود شریف اور نعتوں کی وجہ سے وہ عقیدت مندوں کا حلقہ بھی خاصا رکھتے تھے۔ ان سب باتوں نے غالب پر ان کا مجموعی تاثر ایسا ہی کر دیا تھا۔

جب غالب نے سنا کہ حیدر آباد میں شہید کی اچھی قدر ہو رہی ہے تو

---

[1] ہمس: خطوط غالب ــ ۴۳۱

انہیں اپنی بد قسمتی کا احساس اور بھی زیادہ ہو گیا۔ وہاں ان کے شاگردوں میں حبیب اللہ ذکا موجود تھے انہیں خط لکھ کر تفحص احوال کرتے رہتے تھے۔ حکیم غلام نجف خاں کو ایک خط میں لکھا:[1]

"مولوی فضل رسول صاحب[2] حیدر آباد گئے ہیں، مولوی غلام امام شہید آگے سے وہاں ہیں۔ محی الدولہ محمد یار خاں سورتی نے ان صورتوں کو وہاں بلایا ہے، پر یہ نہیں معلوم کہ وہاں ان کو کیا پیش آیا ہے۔ اگر تم کو کچھ معلوم ہو گیا ہو تو مجھ کو ضرور لکھو۔"

ان جملوں میں جو طنز چھپا ہوا ہے اس کا اندازہ "سورتی" اور صورتوں کے تلازمے ہی سے کیا جا سکتا ہے مگر صحیح لطف تب آئے گا جب یہ معلوم ہو کہ غلام امام شہید بدصورت تھے ان کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے اور کانوں میں قرنا لگا کر سنتے تھے۔ مولوی مظہر علی نے لکھا ہے۔[3]

"مولوی غلام امام .... شہید متوطن الہ آباد آج تشریف لاتے .... شہید صاحب مولود خوب پڑھتے ہیں اور وقت پڑھنے کے عشق آں حضرت میں بے چین ہو جاتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ آواز اچھی نہیں بالفعل ان کی عمر ستر برس کی ہے۔ قرنائی لگا کر سنتے ہیں۔" (۳ اکتوبر ۱۸۶۲ء)

غالب برابر شہید کے بارے میں "لوہ" لگاتے رہتے ہیں۔ ۲۶ اگست ۱۸۶۳ء کو حبیب اللہ ذکا کے موسومہ خط میں لکھتے ہیں۔[4]

"اب آپ اس خط کی رسید لکھیے اور اس میں غلام امام شہید کا حال مفصل لکھیے کہ ان کی وہاں کیا صورت ہے۔ ایک شخص مجھ سے یوں کہتا تھا کہ

---

[1] مہر: خطوط غالب ــ ۳۸۵

[2] منشی فضل رسول واسطی سندیلوی (متوفی ۱۸۷۹ء) جو رشتہ میں شہید کے بھانجے تھے۔ ان کا دیوان نول کشور سے چھپ چکا ہے۔ انہیں مظفر علی اسیر (متوفی ۷ فروری ۱۸۸۲ء) سے تلمذ تھا۔ (نادر روزنامچہ ــ ۳۱)

[3] هاشمی: ایک نادر روزنامچہ ــ ۲۸۔ [4] مہر: خطوط غالب ــ ۳۶۴

مختارالملک نے منہ نہ لگایا مگر محی الدولہ نے چار سو روپیہ مہینہ سرکار جناب عالی سے مقرر کرا دیا ہے۔"

پھر اودھ اخبار میں انہوں نے ایک خبر دیکھی تو جھٹ ذکا کو خط لکھا۔[1]

"ہاں صاحب اودھ اخبار میں ایک قصیدہ مولوی غلام امام کا دیکھا "مکان تنگ است، جہاں تنگ است" مدح مختارالملک میں متضمن استدعائے مسکن وسیع، پھر مہینے بعد اسی اودھ اخبار میں یہ خبر دیکھی کہ نواب نے مسکن تو نہ بدلا مگر تیس روپے مہینہ بڑھا دیا۔ اسی اخبار میں پھر دیکھا کہ ایک صاحب نے مولوی غلام امام کے کلام پر اعتراض کیا ہے اور ان کے شاگرد وضیع تخلص نے اس کا جواب لکھا ہے۔ آپ سے اس روئداد کی تفصیل اور جواب اعتراض و معترض کے نام کا طالب ہوں۔ بہ سبیل استعجال۔"

(۱۱ جنوری ۱۸۶۷ء)

اچھا لطیفہ یہ ہے کہ ذکا نے شہید کو بتا دیا یا انہیں کسی طرح معلوم ہو گیا کہ غالب ان کے بارے میں کیا لکھتے رہتے ہیں۔ اس غریب نے خواجہ غلام غوث خاں بے خبر کو شکایت لکھی کہ مرزا صاحب مجھ سے بے سبب ناراض ہیں۔ بے خبر نے غالب کو لکھا کہ حضرت یہ کیا ماجرا ہے۔ شہید پر آپ کیوں وار کر رہے ہیں۔ اگر کوئی اور ہوتا تو شاید غالب جواب میں شہید تو کیا قتیل کو بھی نہ بخشتے اور خوب کھری کھری سناتے مگر بے خبر لفٹننٹ گورنر کے میر منشی اور غالب کے دوست تھے، ان سے ذرا کور دبتی تھی۔ غالب نے معذرت لکھی۔ وہ خط بھی ملاحظہ ہو:[2]

"منشی حبیب اللہ ذکا کے اشعار آتے رہے اور میں اصلاح دے کر بھیجتا رہا۔ بعد وارد ہونے مولوی صاحب کے ایک غزل ان کی آئی اور انہوں نے یہ لکھا کہ مولوی غلام امام شہید اکبر آبادی کی غزل پر یہ غزل لکھ کر بھیجتا ہوں[3]

---

[1] ماسبق ۔ ۱۷۱
[2] ماسبق ۔ ۳۴۶

میں نے حسب معمول غزل کو اصلاح دے کر بھیجا اور یہ لکھا کہ مولانا شہید اکبرآباد کے ہیں لکھنؤ اور الہ آباد کے ہیں۔ اس کلمے سے زیادہ کوئی بات میں نے نہیں لکھی۔ اس میں سے توہین کے معنی مستنبط ہوں تو میں ان کا مستہن سہی۔ اب نہیں جانتا کہ منشی صاحب نے مولوی صاحب سے کیا کہا اور مولوی صاحب نے آپ کو کیا لکھا۔"

ایک بار غالب کے دوست چودھری عبدالغفور سرور نے انہیں لکھا تھا کہ آپ والیِ دکن کی مدح میں قصیدہ کہہ کر کیوں نہیں بھیجتے۔ وہاں آج کل دھن برس رہا ہے۔ آپ کی بھی ضرور قدردانی ہو گی۔ اس کے جواب میں غالب نے لکھا تھا ؎[1]

"پہلے کچھ باتیں کہ بادی النظر میں خارج از مبحث معلوم ہوں گی، لکھی جاتی ہیں۔ میں پانچ (برس) کا تھا کہ میرا باپ مرا، نو برس کا تھا کہ چچا مرا، اس کی جاگیر کے عوض میرے اور میرے شرکائے حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں دس ہزار روپے سال مقرر ہوتے۔ انہوں نے نہ دیے مگر تین ہزار روپے سال، اس میں سے خاص میری ذات کا حصہ ساڑھے سات سو روپے سال۔ میں نے سرکار انگریزی میں یہ غبن ظاہر کیا۔ کولبرک صاحب بہادر ریزیڈنٹ دہلی اور استرلنگ صاحب بہادر سکرتر گورنمنٹ کلکتہ متفق ہوتے میرا حق دلانے پر۔ ریزیڈنٹ معزول ہو گئے، سکرتر بمرگ ناگاہ مر گئے۔

واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے بہ صلۂ مدح گستری پانسو روپے سال مقرر ہوتے۔ وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جیے۔ یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی۔ دلی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی سات برس مجھ کو روٹی دے کر بگڑی۔ ایسے طالع محسن سوز و مربی کش کہاں پیدا ہوتے ہیں۔ اب جو میں والیٔ دکن کی

---

[1] مہیش خطوط غالب — ۸-۴۹۷۔

طرف رجوع کروں، یاد رہے کہ متوسط مرجائے گا یا معزول ہو جائے گا اور اگر یہ دونوں امر واقع نہ ہوئے تو کوشش اس کی ضائع ہو جائے گی اور والیٔ شہر مجھ کو کچھ نہ دے گا اور احیاناً اس نے سلوک کیا تو ریاست خاک میں مل جائے گی۔ اور ملک میں گدھے کے ہل پھر جائیں گے .... اے خداوند بندہ پرور یہ سب باتیں وقوعی و داعی ہیں۔

اگر ان سے قطع نظر کر کے قصیدے کا قصد کروں، قصد تو کر سکتا ہوں تمام کون کرے گا؟ سوائے ایک ملکہ کے کہ جو پچاس پچپن برس کی مشق کا نتیجہ ہے۔ کوئی قوت باقی نہیں رہی۔ کبھی جو سابق کی اپنی نظم و نثر دیکھتا ہوں تو یہ جانتا ہوں کہ یہ تحریر میری ہے مگر حیران رہتا ہوں کہ یہ نثر میں نے کیوں کر لکھی تھی اور یہ شعر کیوں کر کہے تھے عبدالقادر بیدل کا یہ مصرع گویا میری زبان سے ہے؛

عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

پایان عمر ہے دل و دماغ جواب دے چکے ہیں۔ سو روپے رامپور کے، ساٹھ روپے پنشن کے روٹی کھانے کو بہت ہیں۔ گرانی اور ارزانی امور عامہ میں سے ہے۔ دنیا کے کام خوش و ناخوش چلے جاتے ہیں۔ قافلے کے قافلے آمادۂ رحیل ہیں۔ دیکھو منشی نبی بخش مجھ سے عمر میں چھوٹے تھے، ماہ گذشتہ میں گزر گئے۔ مجھ میں قصیدے کے لکھنے کی قوت کہاں۔ اگر ارادہ کروں تو فرصت کہاں۔ قصیدہ لکھوں آپ کے پاس بھیجوں آپ دکن کو بھیجیں، متوسط کب پیش کرنے کا موقع پائے، پیش کیے پر کیا پیش آئے۔ ان مراحل کے طے ہونے تک میں کیوں کر جیوں گا۔"

یہ خط ۱۸۶۰ء کا ہے اور یہ "بادی النظر میں خارج از مبحث" باتیں انہوں نے تکلفاً ہی لکھی ہیں۔ امر واقع یہ ہے کہ وہ ریاست حیدر آباد سے انتفاع کی برابر کوشش کرتے رہے مگر مطلب برآری نہ ہو سکی۔ حبیب اللہ ذکا کو ایک خط میں لکھا ہے؛ [1]

---

[1] ص ہی، خطوط غالب - ۳- ۶۶۲۔ (غالب نے مختار الملک کی مدح میں جو قصیدہ بھیجا تھا وہ کلیات نظم میں شامل ہے۔ (طبع سوم نول کشور ۱۹۲۴ء صفحات

"صنعت سہل ممتنع میں میں نے نواب مختار الملک کو قصیدہ بھیجا کچھ قدر دانی نہ فرمائی رد فرقۂ وہابیہ میں ایک مثنوی[1] جو سابق میں لکھی تھی وہ محی الدولہ کو بھیجی رسید بھی نہ آئی۔ اب سنتا ہوں کہ مولوی غلام امام شہید شاگرد قتیل وہاں کوس "انا و لاغیری" بجا رہے ہیں اور سخن ناشناسوں کو اپنا زور طبع دکھا رہے ہیں۔ ایک کم ستّر کی عمر میری ہوئی، سوائے شہرت خشک کے فن کا کچھ پھل نہ پایا۔ احسنت و مرحبا کا شور سامعہ فرسا ہوا۔ خیر ستائش کا حق ستائش سے ادا ہوا۔ مختار الملک نے یہ بھی نہ کیا۔ نہ مدح کی داد دی نہ مدح کا صلہ دیا۔ حیران ہوں کہ نواب مجھ کو کیا سمجھے۔ محی الدولہ سے اور کچھ نہیں کہتا مگر یہ کہ خدا سمجھے۔"

ان اقتباسات سے غالباً واضح ہو گیا ہوگا کہ شہید سے غالب کی برہمی (الف) شاگرد قتیل ہونے کی بنا پر (ب) سخن ناشناسوں میں مقبول ہونے کی وجہ سے (ج) حیدر آباد میں ان کے علی الرغم نوازے جانے کے باعث تھی۔

خیر جس زمانے کا یہ خط ہے، اس وقت تو حیدر آباد کا سلسلہ نہ تھا پہلے دو اسباب ہی تھے۔ چنانچہ سر سید نے شہید کے دو شعر لکھ کر تضمین کی فرمائش کی تو اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ آپ کا خط آنے سے تو خوشی ہوئی مگر جس کام کا حکم دیا ہے اس سے رنجیدہ ہوا۔ کسی شاعر کے دو ایک شعر لے کر ان پر دو چار شعر اپنی طرف سے ٹانک دینا کون سی شاعری و معنی پروری ہے؟ اور

---

۳۲۴ وبعد) اور غالب کا دستخطی قصیدہ سالار جنگ میوزیم میں محفوظ ہے۔ اسی میں یہ شعر ہے؛

کس نیست متاع را خریدار
بارے آنکہ بہا گراں نگویم

[1] یہ کلیات نظم کی مثنوی ششم ہے (ص ۹۸) جس کا عنوان ہے "بیان نموداری شان نبوت و ولایت کہ درحقیقت پرتو نور الانوار حضرت الوہیت است" اس مثنوی میں ۱۲۸ اشعار ہیں۔

ہو بھی تو یہ دو شعر اس قابل ہی کہاں ہیں۔ ان میں فارسی کے پرشکوہ لفظوں کے سوا ہے کیا؟ کوئی نازک خیال، کوئی باریک نکتہ تو ہے نہیں۔ پھر یہ ایسی بحر میں ہیں کہ کسی ایرانی نے اس میں آج تک شناوری نہیں کی۔ ان کی تضمین چاہے وہ مسدس ہو یا ترجیع بند، بس اس کام آ سکتی ہے کہ بھکاری یاد کرلیں اور درد بھری آواز سے در در گاتے پھریں اور خاتم المرسلین کا کوئی عاشق شعر سن کر اپنا گریباں چاک کر لے۔ پھر کہتے ہیں کہ واللہ مولانا شہید نے بہت عمدہ شعر لکھے ہیں اور ان سے بہتر لکھے نہیں جا سکتے، مگر یہ شاعری و معنی پروری نہیں ہے، مجلس مولود شریف میں پڑھنے کی چیز ہے۔ حضرت اشرف المرسلین علیہ السلام کی نعت میں اس فقیر نے کئی مثنویاں اور قصیدے کہے ہیں۔ ان میں سے ایک مثنوی نقل کر کے آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ ذرا اسے ملاحظہ فرمائیے۔ مجھ سے شیوۂ معنی پروری کے خلاف کسی قسم کے شعروں کی فرمائش نہ کیجیے۔

اس خط کا ماخذ ایک قلمی نسخہ ہے جس میں بہار دانش وغیرہ متعدد کتابیں ہیں، یہ انجمن محمدیہ آگرہ کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اسی کے ایک سادہ ورق پر کسی نے غالب کا یہ خط نقل کر دیا ہے۔ اس کی پیشانی پر ایک مہر لگی ہوئی ہے جس میں (اصلح الدین ۱۲۶۷ھ) صاف پڑھا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خط غالب کی زندگی میں نقل ہوا ہے۔ فارسی متن ملاحظہ ہو۔

(۲)

بنام جواد الدولہ سید احمد خاں بہادر منصف فتح پور۔

نواب معلی القاب و سید عالی جناب سلامت۔

بہ رسیدن منشور رافت نشان شادمان شدم واناں چہ مرا بسر انجام آں فرماں داداہ اند عنیں۔ یک دو بیت از دیگرے گرفتن و بر آں گفتار دو چار بیت از خویش افزودن کدام آئین سخن وری و کدام شیوۂ معنی پروری است۔ خاصہ ایں دو بیت کہ جز شکوہ الفاظ تازی ہیچ گونہ معنی نازک ندارد و سیاد بحرے

واقع شدہ کہ ہیچ کس از ایرانیاں درآں بحر غزل نگفتہ، انچہ بریں دو بیت افزائید خواہی آں را مسدس نام نہند و خواہی ترجیع بند خوانند۔ خاص از بہر آنست کہ گدایاں یاد گیرند و بر درہا بآہنگ حزیں بخوانند کدام عاشق خاتم المرسلین بسماع ایں اشعار از خود رود و گریبان درد۔ حاشا ثم حاشا مخدومی مولوی غلام امام شہید سلمہ اللہ تعالیٰ ہرچہ گفتہ اند خوش گفتہ اند و خوشتر ازیں نتواں گفت۔ لیکن ایں شاعری و سخن وری نیست، چیزے دیگر ہست کہ در مجلس مولود شریف تواں خواند۔ فقیر حقیر را در نعت اشرف المسلمین علیہ وآلہ السلام قصیدہ ہا مثنویہا[1] است۔ ازاں جملہ یکے مثنوی نقل کردہ بخدمت می فرستم ایں را بنگرند و بخوانند و از بندہ اشعارے کہ شیوۂ سخن گستراں باشد آرزو نکنند و بندہ خود انگارند و بخدمت ہمین برادر خود سلمہ اللہ تعالیٰ، سلام رسانند۔ والسلام۔

از۔ اسد اللہ

(۳)

اسی کتب خانے میں ایک مجموعہ مثنویات ہے (مد ۹ نمبر ۴۶) جس میں ۲۶ مثنویاں شامل ہیں۔ ان میں ساقی نامہ عزت، مثنوی ناصر علی، ساقی نامہ الٰہی، سوز و گداز نوعی، قضا و قدر سلیم، ساقی نامہ ملا مرشد، ساقی نامہ ذکی، قضا و قدر حکیم رکنا مسیح،

---

[1] کلیات نظم فارسی میں غالب کی دو نعتیہ مثنویاں ہیں۔ ایک میں ۱۰۵ اشعار ہیں اور اس شعر سے شروع ہوتی ہے:

بنام ایزد اے کلک قدسی صریر
بہر جنبش از غیب نیرو پذیر

دوسری مثنوی در بیان معراج ۲۷۵ شعروں میں ہے۔ اختصار کی وجہ سے قیاس چاہتا ہے کہ پہلی مثنوی ہی غالب نے اس خط کے ساتھ بھیجی ہوگی۔ اس خط میں نعتیہ قصیدوں کا بھی ذکر ہے۔ کلیات میں ان کے تین قصیدے نعت رسولؐ میں ملتے ہیں۔

قضاوت در رسید اے اشرف اور محسن فانی کی مثنوی موسی و موہنی شامل ہیں۔ اسی مجلد میں کلیات نظم غالب کے کچھ اوراق ہیں۔ یہ صاف نستعلیق میں لکھے ہوئے ہیں اس مجموعہ مثنویات پر جا بجا مہریں بھی ثبت ہیں۔ ایک تو صاف پڑھی جاتی ہے جس پر "دین دیال ۱۲۶۸ھ" لکھا ہوا ہے۔ دوسری ہندی میں ہے۔ یہ مہر بھی دین دیال ہی کی ہے۔ لیکن اس کا سال ٹھیک نہیں پڑھا گیا کہ ۱۸۴۴ء ہے یا سمبت ۱۹۴۴۔ اس میں مجھے شک ہے۔ بہرحال ان اوراق میں ذیل کا قطعہ بھی ملتا ہے جو مرزا سیتا بیگ کے قطعہ تاریخ وفات سے قبل درج ہے۔[1]

رفت چوں مولوی حمید الدین
زیں جہاں کز فنا عمارت اوست

از خود از دہر رفت و دہر ہنوز
پُر ز آوازۂ فضیلت اوست

سیدالانبیاؑ شفیعش باد
کاں سعید ازل ز عزت اوست

دخل را چوں فزوں کنی بر خلد
سال فوتش ہمیں حقیقت اوست

داخل خلد گشت پنداری
دخل در خلد سال رحلت اوست

رمز دریاب تا غلط نہ کنی
زاں کہ تکرار خلد صورت اوست

خلد خلد است بر لب غالب
فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

اس مادۂ تاریخ سے ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۲ء) مستنبط ہوتے ہیں۔ کلیات نظم سے اس کا اخراج ظاہرا مادۂ تاریخ کے بھونڈے پن کی وجہ سے ہوا۔ غالب تاریخ گوئی سے قاصر

---

[1] سیتا بیگ کی وفات کا قطعہ تاریخ کلیات نظم غالب میں موجود ہے۔

تھے اور اس کا انہوں نے متعدد مواقع پر اعتراف کیا ہے۔ میاں داد خاں سیاح کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"بھائی تمہاری جان اور اپنے ایمان کی قسم کہ فن تاریخ گوئی و معما سے بیگانۂ محض ہوں۔ اردو زبان میں کوئی تاریخ میری نہ سُنی ہو گی [1]۔ فارسی زبان میں دو چار تاریخیں ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ مادہ اوروں کا ہے اور اشعار میرے ہیں۔ تم سمجھے کہ میں کیا کہتا ہوں۔ حساب سے میرا جی گھبراتا ہے اور مجھکو جوڑ لگانا نہیں آتا ہے۔ جب کوئی مادہ بناؤں گا حساب درست نہ پاؤں گا۔ دو ایک دوست ایسے تھے کہ اگر حاجت ہوتی تو مادہ تاریخ وہ مجھے ڈھونڈ لا دیتے موزوں میں کرتا۔ اگر آپ نے مادے کی فکر کی ہے اور یہی حساب جمل منظور رکھا ہے تو ایسے تعمیے اور تخرجے آ گئے ہیں کہ وہ تاریخ ہنسی کے قابل ہو گئی ہے۔ کلکتہ میں قاضی القضاۃ سراج الدین خاں مرحوم کی قبر پر مسجد بنی ہے۔ ان کے بھتیجے مولوی ولایت حسین خاں نے استدعائے تاریخ کی، میں نے لکھی۔ چنانچہ وہ فارسی دیوان میں موجود ہے۔

مفتیٔ عقل از پئے تاریخ ایں بنا
ایما بسوئے من ز رہ احترام کرد
گفتم بوئے بدیہہ خوش خانہ خدا
شد خشمگیں دمے کہ نظر در کلام کرد
خاشاک رفت و پائے ادب در شکنجہ ریخت
ایہام را بہ تخرجہ معنی تمام کرد

واسطے خدا کے غور کرو "خوش خانہ خدا" مادہ، پھر اس میں سے خاشاک

---

[1] یہ غلط ہے۔ دیوان اردو نسخہ عرشی میں اردو کے قطعات تاریخ موجود ہیں۔ (ص ۱۲۳)۔

کے عدد دور کرو، نو سو اکیس کا تخرجہ[1] پھر بھی دو اور زیادہ رہے۔ پانے ادب یعنی ب کو اڑایا۔ بھلا یہ بھی کوئی تاریخ ہے۔"

یہی حال مذکورہ بالا قطعہ تاریخ کا ہے۔ مادہ تاریخ ان کے عجز کا شاہد ہے۔ مولوی حمید الدین کون تھے، میں اس کی نشاندہی سے قاصر ہوں۔

••

[1] خاشاک کے عدد تو ۹۲۲ ہوتے ہیں۔ یہاں بھی غالب نے حساب کی غلطی کر دی۔

مختار الدین احمد

غالب کی ایک مہر

غالب کی جن مہروں کا اب تک پتہ چلا ہے اور جو ان کی طرف منسوب کی جاتی ہیں ان کی تعداد چھ ہے۔ اس موضوع پر ایک سیر حاصل اور مفید مضمون جناب مالک رام صاحب نے عرصہ ہوا "ادبی دنیا" لاہور (بابت اپریل ۱۹۴۱ء) میں سپرد قلم کیا تھا۔ ان کی کتاب "ذکر غالب" میں بھی اس کا مختصر تذکرہ ملتا ہے۔ اس مضمونچہ میں اس مہر کے متعلق جس میں عربی کا ایک شعر بھی منقوش ہے، بعض معروضات پیش کیے جاتے ہیں۔

اس مہر کا جو غالب کی طرف منسوب کی جاتی ہے، پہلی مرتبہ ذکر غالباً جناب غلام رسول صاحب مہر نے اپنی کتاب "غالب" میں کیا تھا، جس کی اطلاع انہیں حیدرآباد ریڈیو کی ایک نشری تقریر سے ملی تھی اور جس میں بتایا گیا تھا کہ حیدرآباد کے ایک ذاتی کتاب خانے میں طب کی ایک قلمی کتاب پر غالب کی تحریریں اور حواشی ملتے ہیں اور اس پر ان کی ایک مہر بھی ثبت ہے جس پر عربی کا یہ شعر بھی درج ہے:

رضینا قسمۃ الجبار فینا
لنا علم و للجہال مال

راقم کا خیال ہے کہ وہ مہر مرزا غالب کی نہیں بلکہ ان کے ہم نام اور ہم تخلص ایک دوسرے شاعر اسداللہ خاں غالب کی ہے جو شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ طبیب پیشہ بھی تھے۔

کتب خانہ شاہی برلن (جرمنی) کا بیشتر حصہ دوران جنگ میں ٹیوبنگن اور ماربرگ بھیج دیا گیا تھا جہاں اسے ہوائی حملوں کی زد سے محفوظ کرنے کے لیے زمین دوز تہہ خانوں میں بند کر دیا گیا تھا۔ تقسیم جرمنی سے کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ یہ ذخیرے اب تک

برلن نہ جا سکے اور ان ہی دو مقامات پر موجود ہیں اور مطالعہ و نقل و عکس کی ساری آسانیاں فراہم ہیں۔ راقم کو اپنے کام کے سلسلے میں ان دو مقامات میں بھی قیام کرنے اور ان ذخیروں سے جن میں عربی، فارسی اور ترکی کی بیش بہا قلمی کتابیں جمع ہیں، مستفید ہونے کا موقع ملا۔ ذخیرۂ ماربرگ میں "کلیات طالب کلیم" کا ایک قلمی نسخہ[1] دیکھنے میں آیا جس پر کہیں کہیں تصیحات درج ہیں اور دو تین مقامات پر حواشی میں بعض اشعار کا اضافہ بھی موجود ہے۔ اس کے سرِورق پر سید اسداللہ خاں کی تین مہریں ثبت ہیں اور یہ مستبعد نہیں کہ اضافے اور تصیحات بھی ان ہی کی قلم کے ہوں۔ مہروں کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ ایک چھوٹی سی چوکور مہر پر خط نستعلیق میں سید اسداللہ خاں درج ہے اور ۱۱۴۴ کے اعداد منقوش۔

۲۔ یہ مہر بھی مربع ہے لیکن تقطیع میں پہلی سے بڑی۔ اس میں ظغرا میں عربی کا مذکورہ بالا شعر کندہ ہے اور وسط میں اسداللہ خاں کا نام۔

۳۔ یہ مہر بیضاوی ہے اور تقطیع میں مہر نمبر ۲ سے بھی کچھ بڑی۔ حاشیے میں خطِ نسخ میں وہی عربی شعر اور وسط میں خط نستعلیق میں سید اسداللہ خاں غالب اور ۱۱۵۴ کے اعداد منقوش ہیں۔

اگر راقم کا یہ قیاس غلط نہیں کہ نسخہ حیدرآباد پر ان ہی اسداللہ خاں غالب کی مہر درج ہے تو یہ مہر مرزا غالب کی نہیں ہو سکتی۔ وجوہ یہ ہیں:

۱۔ مرزا غالب سید نہ تھے۔ مہروں میں سید صراحتاً کندہ ہے۔

۲۔ مہروں میں ۱۱۴۴ھ اور ۱۱۵۴ھ کے اعداد منقوش ہیں۔ ظاہر ہے صاحبِ مہر مرزا غالب سے متقدم ہیں، اس وقت تو مرزا پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔

۳۔ مرزا غالب سے یہ مستبعد ہے کہ وہ اپنی مہر میں عربی کا کوئی شعر کندہ کراتے۔ عام طور پر ان کی مہریں مختصر اور چھوٹی ہیں۔ مہروں میں وہ لفاف

---

[1] نمبر او کٹو ۱۰۰۰ فہرست فارسی کتب خانہ شاہی برلن۔

کے پتّے کی طرح حشو و زوائد پسند نہ کرتے تھے۔ پورا شعر کندہ کرانا شاید ہی انہیں مرغوب ہوتا۔ بفرضِ محال وہ کسی عربی شعر کی بجائے فارسی یا اردو کا کوئی اپنا ہی شعر اس موقع پر انتخاب کرتے۔ (کلیات غالب طبع اول میں جو تصویر انہوں نے شائع کرائی ہے اس پر اپنا فارسی شعر " غالب نام آورم نام و نشانم مپرس۔ ہم اسداللہم و ہم اسدالاہیم " درج کرایا ہے۔ پھر اس میں بھی شبہ ہے کہ وہ اس مضمون کا شعر انتخاب کرتے۔ مرزا دنیاوی سمجھ بہت اچھی رکھتے تھے۔ اور وہ نوابان رامپور، شہزادوں، والیان ملک اور دوسرے امرا سے اپنی مہر میں " للجہال مال " لکھ کر تعلقات خراب کرنا کبھی پسند نہ کرتے۔ (نسخہ مار برگ کی مہر میں " للجہال " کے بجائے للاعدا ہے اور یہی روایت مشہور ہے۔)

۴۔ ان کی طرف یہ منسوب مہر اب تک کسی خط یا ان کی مملوکہ کسی کتاب پر دیکھنے میں نہیں آئی۔

۵۔ حیدر آباد میں جس نسخے پر یہ مہر ثبت بتائی جاتی ہے وہ طب کی کتاب ہے فن طب کی کسی کتاب سے مرزا غالب کی دلچسپی دور از قیاس ہے کہ وہ مطالعہ کرتے اور اس پر توجہ سے حواشی لکھتے۔ کلیات کلیم سے ان کی دلچسپی ظاہر ہے بلکہ ان کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس اس کا ایک نسخہ رہا تھا۔ لیکن اس پر جو تحریریں ہیں وہ مرزا غالب کی شان خط سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتیں۔ یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ یہ دونوں کتابیں حکیم اسداللہ خاں کے کتب خانے کی ہیں۔ اس لیے کہ انہیں طب کے علاوہ شاعری سے بھی دلچسپی تھی۔ تذکروں میں ان کے طبیب اور شاعر ہونے کا ذکر بھی موجود ہے۔

۶۔ ہم محققین سے اس بات کی توقع نہیں کرسکتے کہ وہ ہر معاملے کی خود تحقیق کریں اور نہ " غالب " اور " ذکرِ غالب " کے مصنفین سے یہ ممکن تھا کہ وہ اس معاملہ کی تحقیق کے لیے حیدر آباد کا سفر کرتے۔ مقرر کا فرض تھا کہ وہ

صحیح حالات فراہم کرتے۔ ظاہرا انہوں نے مہر میں "سید" کا لفظ اور مہر کندہ ہونے کے سنین درج نہیں کیے ورنہ فاضل مصنفین کو یہ غلط فہمی نہیں ہوتی۔[1]

اگر نسخہ حیدر آباد کی مہر ان مہروں سے مختلف نہیں جو مخطوطہ المانیہ پر ثبت ہیں اور ان میں سید کا لفظ موجود ہے اور ۱۱۴۴ یا ۱۱۵۴ کے اعداد بھی منقوش ہیں تو بلاشبہ یہ مہر مرزا غالب کی مہر نہیں ہو سکتی۔

مضمون کے آخر میں دو باتیں لکھنی ضروری ہیں۔

عربی کا مذکورہ شعر ایک مشہور قطعہ کا ہے۔

رضینا قسمۃ الجبار فینا
لنا علم و للاعداً مال
فان المال یفنی عن قریب
وان العلم باق لا یزال

گزشتہ سال ڈاکٹر نظام الدین صاحب (دائرۃ المعارف، حیدر آباد) اور آغا حیدر حسن دہلوی کے عزیز اور خویش آکسفورڈ تشریف لاتے تھے۔ میرے استاد ہملٹن گب نے مجھے اس بات پر مامور کیا کہ انہیں آکسفورڈ کی سیر کراؤں اور یہاں کے کالج اور ادارے دکھاؤں۔ میں انہیں ایشمولین میوزیم کا وہ شوکیس دکھا رہا تھا جس میں سیکڑوں قسم کی ہزاروں انگوٹھیاں اور مہریں قدیم ترین زمانہ سے لے کر انیسویں

---

[1] مالک رام صاحب کے مضمون مطبوعہ ادبی دنیا بابت ماہ اپریل ۱۹۴۱ سے ذیل کا اقتباس فاضل مضمون نگار (ڈاکٹر مختار الدین آرزو) کی اطلاع کے لیے کافی ہے۔

"اس مہر کا ذکر سب سے پہلے جناب محمد عبدالرزاق صاحب راشد مددگار معتمد فنانس ریاست حیدر آباد دکن نے اپنی ایک ریڈیو تقریر میں کیا تھا جو وہاں کے روزنامہ "صحیفہ" کی اشاعت ۲۰ فروری ۱۹۳۶ میں شائع ہوئی۔ اس تقریر میں جناب راشد صاحب نے کہا تھا کہ ڈاکٹر سید قاسم صاحب (پتھر گھٹی حیدر آباد) کے کتب خانے میں علم طب کی ایک قلمی کتاب "ذخیرہ دولت شاہی" ہے جس پر مرزا غالب کی مندرجہ

صدی تک کی محفوظ ہیں۔ ان میں شاہوں اور وزرا کی انگوٹھیاں تھیں اور امراد روسا کے ساتھ ساتھ اور ادبا کی بھی۔ یہاں ایسی مہریں بھی تھیں جو نہ جانے کتنی مرتبہ بے قصوروں کو قید و بند اور شہادت کے جواز میں سرمحضر لگی تھیں اور ایسی بھی جن سے کتنی ہی مرتبہ خلعتیں اور جاگیریں بخشی گئی تھیں۔ ان کامیاب عاشقوں کی انگوٹھیاں بھی

صدر مہر ہے اور کتاب کے صفحات پر حاشیے میں غالب کی تحریریں موجود بھی ہیں۔

پچھلے دنوں ایک کام سے مجھے حیدر آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ اس کتاب کو دیکھنے کے لیے میں ڈاکٹر سید قاسم صاحب کے دولت خانے پر حاضر ہوا۔ انھوں نے بہت مہربانی فرمائی کہ کتاب مشارالیہ مجھے دیکھنے کو دی۔ میں نے سرورق پر مہر دیکھی واقعی مرزا غالب کی مہر ہے۔ مربع شکل ہے۔ اور گرد یہ شعر کندہ ہے:

رضینا قسمتہ الجبار فینا
لنا علم وللجہال مال

اور عین وسط میں لکھا ہے۔ اسد اللہ خاں غالب ۱۲۵۴ھ مہر کی پیشانی پر خط نستعلیق میں ہاتھ سے یہ شعر لکھا ہے اور نیچے اسد اللہ خاں دہلوی، جیسا کہ جناب راشد صاحب نے فرمایا تھا۔ کتاب میں جا بجا حاشیے پر تحریریں ہیں جو اُن کے خیال میں غالب کے ہاتھ کی ہیں۔ لیکن میں پوری ذمہ داری اور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان تمام تحریروں میں زیادہ سے زیادہ دو صفحوں کے سوا نے اور کوئی تحریر مرزا کے ہاتھ کی نہیں۔ ان دو حاشیوں کا سوادِ خط ضرور مرزا کے خط سے مشابہ ہے اور یہ غالباً ان ہی کے قلم سے لکھی گئی ہیں۔ سرورق پر شعر اور اسد اللہ خاں دہلوی بھی مرزا کے ہاتھ کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ نہ یہ ان کا خط ہے اور نہ وہ اس طرح دستخط ہی کیا کرتے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب" (یہ مہر اور کسی جگہ میری نظر سے نہیں گزری)

ڈاکٹر آرزو صاحب نے جو مہر دیکھی ہے وہ بیضاوی ہے اور سالک رام صاحب نے جو مہر دیکھی ہے مربع شکل ہے۔ اول الذکر مہر میں اسد اللہ خاں غالب سے پہلے "سید" موجود ہے۔ موخرالذکر میں موجود نہیں۔ اول الذکر میں ۱۱۵۴ درج ہے اور موخرالذکر میں ۱۲۵۴ھ موجود۔ ان اختلافات کی بنا پر یہ دونوں مہریں مختلف نظر آتی ہیں۔"

تھیں جنھوں نے پیمان وفا باندھتے وقت اپنی محبوباؤں کو پیش کیا تھا، اور جن پر ان کے نام منقوش تھے اور ایسے حرماں نصیبوں کی بھی تھیں جنھوں نے زندگی سے تنگ آکر اس کا ہیرا چاٹ لیا تھا۔ جب ہم ایسی انگوٹھیاں دیکھ رہے تھے جن سے انگلستان کے بادشاہ مہروں کا کام لیتے تھے، تو ڈاکٹر محمد نظام الدین صاحب نے اپنے ہمسفر کی انگلی کی طرف اشارہ کیا اور مجھ سے پوچھا اس مہر کو آپ پہچانتے ہیں؟ یہ مرزا غالب کی مشہور مہر تھی۔ عقیق پر نہایت خوبصورت حروف میں نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کے الفاظ منقوش تھے۔ مختلف کاغذوں پر متعدد بار اس کے نقوش دیکھنے میں آتے تھے۔ اب پہلی مرتبہ جو اس مہر کی زیارت ہوئی تو حیرت، شوق اور تعظیم کے ملے جلے جذبات میں میں نے اسے دیکھا۔ کتنے زمانے تک یہ مرزا کے پاس رہی ہوگی کتنی مرتبہ انہوں نے اسے چھوا ہوگا۔ کتابوں اور خطوط پر اس سے مہر لگائی ہوگی۔ کتنی بار اسے اپنی انگلیوں میں پہنا ہوگا، اتارا ہوگا اور کتنی مرتبہ شعر سوچتے وقت اسے انہوں نے اپنی انگلیوں میں گردش دی ہوگی۔

آغا حیدر حسن صاحب مرزا کے رشتہ داروں میں ہیں اور اس طرح انہیں یہ نعمت ہاتھ لگی ہے۔ نواب معظم علی خاں بھوپال کے پاس کہا جاتا ہے مرزا کا پیالہ موجود ہے۔ لوہارو اور پٹودی میں بھی تعجب نہیں کچھ آثار موجود ہوں۔ یہ ساری چیزیں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے میوزیم یا کسی اور مستند جگہ پر محفوظ ہو جاتیں تو کیسا اچھا ہو۔

(ٹیوبنگن۔ جرمنی۔ ۴ فروری ۱۹۵۵)

قدرت نقوی

غالب کے خطوط کی تاریخیں اور ترتیب

غالب کے زمانے میں کسے خبر تھی کہ غالب کے خطوط ادبی حیثیت سے بلند تر ہونے کے علاوہ ایک اہم تاریخی دستاویز کا بھی کام دیں گے۔ غالب خود ان کی اشاعت وطباعت کے مخالف تھے، لیکن جب ادبی اہمیت کا احساس ہوا تو انہوں نے خود طباعت کے کام میں مدد دی اور اپنے خطوط کی نقول فراہم کرنے میں مرتبین عودہندی وارد وئے معلیٰ کا ہاتھ بٹایا۔

غالب کے زمانے میں صرف ادب ملحوظ تھا۔ اس وجہ سے کسی نے بھی تاریخوں کی درستی کی طرف توجہ نہیں کی۔ نیز ترتیب میں بھی تاریخی حیثیت کو نظرانداز کر دیا چنانچہ عودہندی اور اردوئے معلیٰ میں خطوط بکھرے ہوتے ہیں۔ اردوئے معلیٰ میں مرتبین نے صرف اس امر کو ملحوظ رکھا کہ سہل رقعات حصہ اول میں جمع کیے اور مشکل رقعات حصہ دوم میں شامل کر دیتے۔ لیکن جب ۱۹۲۲ء میں مجیدی پریس کانپور کے کارپردازان نے اردوئے معلیٰ کی طباعت کا اہتمام کیا تو مولوی محمد منیر صاحب نے دونوں حصوں میں ہر مکتوب الیہ کے نام جتنے خطوط تھے سب کو یکجا کر دیا، لیکن بلحاظ تاریخ ترتیب نہ دیا۔ اردوئے معلیٰ لاہور میں وہی قدیم ترتیب قائم رہی، البتہ شیر محمد صاحب سرخوش نے مولانا حسرت موہانی کے رسالہ "اردوئے معلیٰ" علی گڑھ میں مطبوعہ خطوط بنام قدر بلگرامی ولطیف احمد بلگرامی بطور ضمیمہ شامل کر دیتے۔

تاریخی اعتبار سے ترتیب دینے کی اولیت کا سہرا منشی مہیش پرشاد آنجہانی کے سر ہے جنہوں نے کچھ خطوط تاریخی اعتبار سے ترتیب دے کر "خطوط غالب" کے نام سے طبع کر دیتے۔ مولانا غلام رسول مہر نے جملہ خطوط کو بلحاظ تاریخ "خطوط غالب" ہی کے نام سے دو جلدوں میں مرتب کیا اور لاہور میں طبع کرایا جن میں عودہندی اور اردوئے معلیٰ کے

علاوہ مختلف رسائل میں مطبوعہ خطوط بھی شامل ہیں۔ دو مجموعے مکاتیب غالب از مولانا عرشی، اور نادرات غالب از آفاق دہلوی بلحاظ تاریخ مرتب کیے گئے ہیں۔

مندرجہ بالا کوششیں قابل تحسین ہیں کیونکہ ان کی بدولت آگے بڑھنے کا راستہ ایک حد تک صاف ہوگیا ہے۔ لیکن تاریخی اعتبار سے ترتیب دینے میں جس محنت کی ضرورت تھی، اس کے لیے غالباً ان بزرگوں کو فرصت نہ مل سکی اور ترتیب وصحت تاریخ میں تاحال غلطیاں موجود ہیں۔ متن میں الفاظ کی غلطیاں الگ پائی جاتی ہیں۔ اگر تاریخی اعتبار سے صحیح طور پر مرتب کر دیا جاتے تو بہت سے واقعات پر کماحقہ روشنی پڑ جاتے۔ بالخصوص، ۱۸۵۷ء اور اس کے بعد جو واقعات رونما ہوتے ہیں اور جن کو غالب نے اپنے خطوں میں بیان کیا ہے۔ ایک ترتیب و تسلسل کے تحت ہمارے سامنے آجائیں۔ خواجہ حسن نظامی نے اسی قسم کی کوشش کر کے "غالب کا روزنامچہ" مرتب کیا تھا۔ لیکن چونکہ عود ہندی اور اردوئے معلیٰ میں خطوط کی ترتیب درست نہ تھی، اس لیے اس میں بھی یہ خامی باقی رہی اور واقعاتی تسلسل قائم نہ ہو سکا۔

غالب کے جملہ خطوط پر اگر نظر ڈالی جاتے تو بلحاظ تاریخ وہ دو نوعیت کے ہیں۔

۱۔ وہ خطوط جن پر تاریخ ثبت ہے:

(ا) صحت تاریخ کا قرینہ موجود ہے۔

(ب) صحت تاریخ کا کوئی قرینہ موجود نہیں۔

۲۔ وہ خطوط جن پر تاریخ ثبت نہیں ہے:

(ا) تعین تاریخ کا قرینہ موجود ہے۔

(ب) تعین تاریخ کا کوئی قرینہ موجود نہیں۔

آج "خطوط غالب" کے پہلے مکتوب الیہ امین الدین خاں کے نام جتنے خطوط ہیں، ان پر بطور مثال روشنی ڈالی جاتی ہے۔ خطوط غالب اور اردوئے معلیٰ میں ان کے نام صرف چھ خط ہیں اور دو خط رسالہ نقوش کے مکاتیب نمبر میں شائع ہوتے ہیں۔ گویا مجموعی تعداد آٹھ ہے۔ اردوئے معلیٰ کانپور (۱۹۲۲ء) میں یہ خطوط صفحہ ۲۹۳ تا صفحہ ۲۹۶ اور اردوئے معلیٰ لاہور (۱۹۳۰ء) میں صفحہ ۲۸۶ تا صفحہ ۲۹۰ طبع ہوتے ہیں۔ ان خطوط

میں پہلے اور آٹھویں خط پر کوئی تاریخ نہیں، چھٹے خط کی تاریخ بغیر سن مندرج ہے۔ لیکن ان تینوں میں تعین تاریخ کے قرائن موجود ہیں۔

خطوط غالب میں پہلا خط "بھائی صاحب ساٹھ برس سے ... الخ" ہے۔ اس پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے۔ لیکن تعین تاریخ کا قرینہ موجود ہے جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ قریبی زمانہ تحریر کیا ہے۔ خط مذکورہ میں غالب نے اپنی ایک تمنا لکھی ہے۔

"میری زوجہ تمہاری بہن، میرے بچے تمہارے بچے ہیں۔ خود جو میری حقیقی بھتیجی ہے اس کی اولاد بھی تمہاری اولاد ہے[1] تمہارے واسطے بلکہ ان بیکسوں کے واسطے تمہارا دعا گو ہوں اور تمہاری سلامتی چاہتا ہوں۔ تمنا یہ ہے اور انشاالله تعالیٰ ایسا ہی ہو گا کہ تم جیتے رہو اور تم دونوں (امین الدین اور ضیاء الدین) کے سامنے مر جاؤں۔ تاکہ اس قافلے کو اگر روٹی نہ دو گے تو جینے دو گے اور اگر جینے بھی نہ دو گے اور بات نہ پوچھو گے تو میری بلا سے۔ میں تو موافق اپنے تصور کے مرتے وقت فلک زدول کے غم میں نہ الجھوں گا۔"

غالب اس زمانے میں تاہل کی زندگی سے بیزار تھے، اور وہ تجرد کی زندگی گزارنا چاہتے تھے۔ ان کا ارادہ کسی ریاست میں چلے جانے کا تھا۔ حکیم محمود خاں کے پاس غالب کا قیام تھا۔ وہ ریاست پٹیالہ میں راجہ کے طبیب خاص تھے۔ ان کی تحریک پر یا خود ہی غالب پٹیالہ جانے کے خواہاں تھے۔ لیکن ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ کیونکہ ہنگامہ ۵۷ء کے بعد ان کے متعلقین کی کفالت کرنے کی کسی میں بھی استطاعت نہیں تھی۔ جب حکیم صاحب ۲۶ مارچ ۱۸۵۸ء کو پٹیالہ چلے گئے تو حکیم غلام نجف کے پٹیالہ نہ جانے کے استفسار کے جواب میں لکھتے ہیں:

"بھائی۔ میرا ذکر سنو۔ ہر شخص کو غم موافق اس کی طبیعت

---

[1] یہاں نہ کے بعد "صرف" ہونا چاہیے جو نہ معلوم کس وجہ سے تمام نسخوں میں نہیں ہے۔

کے ہوتا ہے۔ ایک کو تنہائی سے نفور ہے، ایک کو تنہائی منظور
ہے۔ تاہل میری موت ہے۔ میں کبھی اس گرفتاری سے خوش
نہیں رہا۔ پٹیالہ جانے میں سبکی اور ذلت تھی، اگرچہ مجھ کو
دولت تنہائی میسر آجاتی، لیکن اس تنہائی چند روزہ اور
تجرید مستعار کی کیا خوشی۔ خدا نے لاولد رکھا۔ شکر بجا لایا تھا
خدا نے میرا شکر قبول و منظور نہ کیا۔ یہ بلا بھی قبیلہ داری
کی شکل کا نتیجہ ہے، یعنی جس لوہے کا طوق اسی لوہے کی دو
ہتھکڑیاں بھی پڑ گئیں۔" [1]

خط مذکورہ بالا یکم اپریل ۱۸۵۸ء کے بعد کا ہے۔ کیونکہ یکم اپریل کے خط میں حکیم احسن اللہ خاں کی نظر بندی کا ختم ہونا اور ان سے ملاقات کا نہ ہونا تحریر ہے اور اس میں ان سے بعد نظر بندی ملاقات کا ہونا مذکور ہے اس لیے حکیم غلام نجف کے نام کا یہ خط وسط اپریل کا ہے۔

خط بالا سے اس کا اندازہ ہوا کہ غالب تاہل کی زندگی سے بیزار تھے بالخصوص غدر کے زمانے میں جب کہ پنشن بھی بند ہو گئی تھی، چنانچہ دستنبو کے خاتمے میں لکھتے ہیں:

"پنشن سابقہ اگر مل جاتے تو بھی کچھ نہیں ہوگا اور اگر نہ ملے تو
حال تباہ ہوگا۔ یہاں کی آب و ہوا کمزوروں کے لیے بہترین
ہے۔ شہر سے بھاگ جانا چاہیے اور کسی دوسری بستی میں رہائش [2]
اختیار کرنی چاہیے۔" [3]

یہ عبارت ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ء کی ہے۔ غرض وہ دہلی چھوڑ کر جانا چاہتے تھے۔

---

[1] طوق سے مراد بیوی اور ہتھکڑیوں سے مراد پسران عارف (حسین علی و باقر علی)، ہیں جن کو غالب نے پالا تھا۔

[2] تعجب ہے غالب "رہائش" کو صحیح قرار دیتے تھے۔

[3] کلیات نثر مطبوعہ ۱۸۸۸ء

صرف مسئلہ اہل خاندان کی کفالت کا تھا۔ دہلی میں لے دے کر ان کے اعزا میں خاندان لوہارو تھا لیکن اس کے خاندان کے سربراہ غدر کے ملزمین میں شامل تھے، بے گناہ ثابت ہو چکے تھے لیکن پھر بھی نظر بند تھے اور جاگیر سے دور۔ ایسی حالت میں اہل و عیال کو کس پر چھوڑ جاتے لہذا پٹیالہ جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ امین الدین خاں اور ضیاء الدین خاں کو ریاست پر جانے کی اجازت اگست میں ملی تھی کیونکہ ۱۲ اپریل ۱۸۵۸ کو شہاب الدین خاں کو لکھا ہے۔

"میرا جی تو یہ چاہتا تھا کہ اب جو خط تمہیں لکھوں اس کے آغاز میں یہ لکھوں کہ مبارک ہو۔ تمہارے اب و عم (امین الدین خاں و ضیاء الدین خاں) مع الخیر جاگیر کو روانہ ہو گئے۔" [1]

اور جب دستنبو ختم کر کے چھپنے بھیج دی اور مجروح کو اطلاع دی کہ تحریر ختم کر دی۔ اس کا آخری حصہ نقل کر کے بھیجا تو مجروح نے بادشاہ دہلی اور امین الدین خاں و ضیاالدین خاں کے حالات اندراج کے متعلق معلوم کیا تو جواب میں لکھا؛

"امین الدین خاں کو جاگیر ملنے کا حال اور بادشاہ کی روانگی کا حال کیونکر لکھتا۔ ان کو جاگیر اگست میں ملی۔ بادشاہ اکتوبر میں گئے۔" [2]

اگست میں جاگیر ملی تو امین الدین خاں وہاں گئے۔ ان کے فرزند علاالدین خاں اور دیگر متعلقین وہیں تھے۔ ضیاالدین خاں اپنی والدہ کو لینے لوہارو گئے ہیں۔ اس خط میں غالب نے اس کی اطلاع بھی دی ہے اور آنے کے لیے بھی لکھا ہے۔

"جناب والدہ ماجدہ تمہاری یہاں آنا چاہتی ہیں اور ضیاالدین خاں اسی واسطے وہاں پہنچے ہیں۔ سنو بعد تبدیل آب و ہوا دو فائدے اور بھی بہت بڑے ہیں۔ کثرت اطبا صحبت احبا۔ تنہائی سے نہ ملول رہو گے۔ حرف و حکایت میں مشغول رہو گے۔ آؤ آؤ"

---

[1] خطوط غالب (لاہور) ص ۱۰۷۔

[2] خط نمبر ۶ خطوط غالب — ص ۲۷۰۔

شتاب آؤ بھائی۔"

جب یہ سب دہلی آ گئے تو غالب نے پھر اس مسئلے کو سب کے سامنے پیش کیا اور ان کے منظور کر لینے کے بعد علاؤ الدین خاں علائی کو لکھا:

"اپنا مقصود تمہارے والد ماجد سے اور تمہاری جدۂ ماجدہ اور تمہارے عم عالی مقدار سے کہہ چکا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ میری بی بی اور بچوں کو کہ یہ تمہاری قوم کے ہیں مجھ سے لے لو کہ میں اب اس بوجھ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے بھی بشرط ان لوگوں کے لوہارو جانے کے، اس خواہش کو قبول کیا۔ میرا قصد سیاحت کلی ہے۔ پنشن اگر کھل جائے گا تو وہ اپنے صرف میں لایا کروں گا۔ جہاں جی لگا وہاں رہ گیا، جہاں سے دل اکھڑا چل دیا۔"

یہ خط بنام علائی ۲۳ اگست ۱۸۵۸ء کا ہے۔ ضیاء الدین خاں کی آمد و رفت و قیام لوہارو کا عرصہ زیادہ سے زیادہ چار پانچ یوم مقرر کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے خط زیر بحث بنام امین الدین اگست ۵۸ء کے عشرۂ ثانی کی ابتدا (۱۱ اگست تا ۱۵ اگست) کا قرار دیا جا سکتا ہے۔

یہاں ایک پہلو تشنہ رہ جاتا ہے کہ جب امین الدین خاں کو جاگیر پر جانے کی اجازت اگست میں ملی اور وہ اپنی جاگیر پر غدر کے بعد اگست میں ہی گئے تو اتنی جلدی واپسی کیوں ہوئی۔ اس سلسلہ میں دو باتیں ملحوظ رہیں تو معاملہ واضح ہو جاتا ہے۔ اول یہ کہ علاؤ الدین خاں وغیرہ ریاست میں تھے جو دیکھ بھال کر رہے تھے، لہٰذا امور ریاست میں کسی قسم کا خلل نہ تھا۔ اس وجہ سے ریاست کی دیکھ بھال کی طرف سے بے فکری تھی۔ دوم یہ کہ امین الدین خاں بیمار تھے، جیسا کہ زیر بحث خط سے ظاہر ہوتا ہے۔ "بعد تبدیلی آب و ہوا، دو فائدے اور بھی بہت بڑے ہیں۔ کثرت اطبا اور صحبت احبا۔" لہٰذا جلد واپس آ جانا کوئی تعجب کی بات نہیں اور امر بعید نہیں۔

مندرجہ بالا شواہد و قرائن کی روشنی میں یہ خط اگست ۱۸۵۸ کے عشرۂ ثانی

کی ابتدا کا لکھا ہوا ہے۔

خطوط نمبر ۲ تا ۵ (خطوط غالب) کی تاریخوں میں جزوی اختلاف ہے۔ خط ۲ کی تاریخ عیسوی خطوط غالب میں ۲۳ جون ۶۴ء طبع ہوئی ہے۔ لیکن خط میں یوم الخمیس ۱۷ محرم ۱۲۸۱ھ درج ہے۔ تاریخ ہجری کی مطابقت تاریخ عیسوی سے کرتے وقت صرف جنتری کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور دن کو نظر انداز کر دیا گیا ہے یوم الخمیس (جمعرات) کو جون کی ۲۳ واقع ہوتی ہے۔ لہٰذا یوم الخمیس ۱۷ محرم ۱۲۸۱ھ مطابق ۲۳ جون ۱۸۶۴ء صحیح تاریخ ہے۔ کیونکہ ہجری مہینہ کی تاریخیں رویت ہلال پر مبنی ہوتی ہیں، اس لیے غالب کا لکھا ہوا دن درست ہے۔

خط نمبر ۳ کی تاریخ اردوئے معلیٰ کانپور میں جمعہ ۲۲ مئی ۱۸۶۵ء غلط چھپی ہے چھ اور دو کے ہندسوں میں تجنیس خطی کی بنا پر عموماً التباس واقع ہو جاتا ہے۔ ۲۶ کو ۲۲ کاتب نے بنا دیا۔ کیونکہ عبارت خط میں ۲۵ مئی موجود ہے۔ نیز جمعہ کو ۲۶ مئی واقع ہوتی۔ ۲۲ نہیں۔ اسی لیے خطوط غالب اور اردوئے معلیٰ لاہور میں ۲۶ مئی ۶۵ء صحیح تاریخ ہے۔

خط نمبر ۴ کی تاریخ اردوئے معلیٰ کانپور میں چہارشنبہ ۲ ربیع الاول ۱۲۸۲ھ اور اردوئے معلیٰ لاہور و خطوط غالب میں چہارشنبہ ۲ ربیع الاول ۱۲۸۲ھ طبع ہوئی ہے۔ خطوط میں ۲۶ جولائی ۱۸۶۵ سے مطابقت دکھائی ہے۔ اردوئے معلیٰ کانپور میں تاریخ غلط ہے کیونکہ بموجب رواج یکم ربیع الاول لکھا جانا چاہیئے تھا۔ اس کو سہو کاتب خیال کیا جاتے۔ اسی طرح خط نمبر ۵ کی تاریخ بھی اردوئے معلیٰ کانپور میں ۱۵ نومبر ۱۸۲۶ء غلط شائع ہوئی ہے۔ اردوئے معلیٰ لاہور اور خطوط غالب میں ۱۵ نومبر ۱۸۶۶ صحیح ہے۔ اس کو بھی سہو کاتب پر محمول کرنا چاہیے۔

خط نمبر ۶ کے آخر میں اردو معلی کانپور و لاہور اور خطوط غالب میں کوئی تاریخ درج نہیں ہے۔ عبارت خط میں صرف ۲۲ جون مرقوم ہے۔ مولانا مہر نے حاشیہ میں لکھا ہے:

"میرا اندازہ ہے کہ یہ خط جون ۱۸۶۷ کا ہوگا۔ اس میں امیرالدین احمد خاں عرف فرخ مرزا سے گفتگو کا مفاد درج کیا ہے۔ ان کی پیدائش

۱۸۶۱ میں ہوئی. اسی لیے انہیں بالشت بھر کا لڑکا بتایا گیا ہے۔"[1]
مولانا نے اندازہ لگانے میں صرف فرخ مرزا کی عمر کا لحاظ رکھا اور مندرجہ خط کو نظر انداز کر دیا ہے. درحقیقت یہ خط ۱۸۶۵ء کا ہے. کیونکہ اس خط میں گرمی کی شدت کے ساتھ علاؤ الدین کا مع اہل و عیال دہلی میں مقیم ہونا اور اپنے والد امین الدین خاں سے نا اتفاقی مذکور ہے اور یہ امور ۱۸۶۵ سے متعلق ہیں. شواہد ملاحظہ ہوں:

(۱) غالب کے خط سے مترشح ہے کہ گرمی کی شدت ہے اور علاؤ الدین خاں مع اہل و عیال دہلی میں مقیم ہیں۔ چنانچہ غالب گرمی کی شدت کا ذکر کر کے لکھتے ہیں:

"خیر اب فصل سے قطع نظر ایک کودک غریب الوطن کے اختلاط کی گرمی کا ذکر کرتا ہوں کہ وہ جانسوز نہیں بلکہ دل افروز ہے۔ پرسوں فرخ مرزا آیا. اس کا باپ بھی اس کے ساتھ تھا"

علاؤ الدین خاں لوہارو سے کب دہلی آتے اس کے لیے یہ اقتباسات ملاحظہ ہوں.
غالب علاؤ الدین خاں کی آمد کے بے حد منتظر تھے. چنانچہ انہیں لکھتے ہیں:

"رجب بیگ، شعبان بیگ، رمضان بیگ یہ نامور مہینے ہیں، سو خالی گئے. شوال بیگ آدمی کا نام سنا نہیں، ہاں عیدی بیگ ہو سکتا ہے. پس جب عید ہے اور روز سعید ہے تو کیا بعید ہے کہ بخلاف مشہور ثلاثۂ ماضیہ اس مہینے میں تم آ سکو۔"[2]

(۲۳ فروری ۱۸۶۵ء)

علاؤ الدین خاں غالباً اپریل کے آخر یا مئی کے شروع میں دہلی آ گئے تھے ان کی آمد کے بعد ۲۶ مئی ۶۵ء کو امین الدین خاں کو لکھا ہے:

"ریگستان کے ملک (لوہارو) سے ایک سردار زادہ کثیر العیال

---

[1] خطوط غالب حاشیہ ص ۵۳
[2] خط نمبر ۴۵ ص ۹۸ ۲۳ فروری ۶۵ء

عسیر الحال عربی، فارسی، انگریزی تین زبانوں کا عالم دلی میں وارد ہوا ہے۔ بلی ماروں کے محلے میں ٹھہرا ہے۔" ؎۱

دہلی میں ان کا قیام آخر جولائی تک یقینی اور ستمبر ۱۸۶۵ء تک ظنی ہے۔ غالب نے غلام غوث خاں بے خبر کو، جولائی ۱۸۶۵ کے خط میں لکھا:

"بھائی امین الدین خاں کے اصرار سے خسرو کی غزل پر ایک غزل لکھی ہے۔ علاء الدین نے اس کی نقل ان کو بھیج دی ہے۔ میں دیوان پر نہیں چڑھاتا مسودہ بھیجتا ہوں۔ تقدیم و تاخیر بند سول کے مطابق ملحوظ رہے۔ گرمی کی شدت سے حواس بجا نہیں۔ معہذا امراض جسمانی و آلام روحانی" ؎۲

اور ۲۲ جولائی کو امین الدین خاں کو لکھا:

"وکیل حاضر باش دربار اسد اللہی یعنی علائی مولائی نے اپنے موکل (امین الدین خاں) کی خوشنودی کے واسطے فقیر کی گردن پر سوار ہو کر ایک اردو کی غزل لکھوائی۔ اگر پسند آتے تو مطرب کو سکھائی جائے اور جھنجھوٹی کے اونچے سروں میں راہ رکھوائی جائے۔"

ان اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ جون ۱۸۶۵ء میں علاء الدین خاں دہلی میں مقیم تھے۔

(۲) علاء الدین خاں کی اپنے والد امین الدین خاں سے کسی معاملہ میں شکر رنجی ہو گئی تھی۔ غالب نے صلح کرانے میں کوشش کی اور علاء الدین خاں کی خوب وکالت کی ہے۔ خط نمبر ۳، نمبر ۴ اور خط زیر بحث میں یہ ذکر موجود ہے۔ خط ۳ مورخہ ۲۶ مئی ۱۸۶۵ء میں اقتباس بالا کے بعد لکھا ہے۔

"بلی ماروں کے محلے میں ٹھہرا ہے۔ بحسب ضرورت حکام شہر

؎۱ خط نمبر ۳ ص ۴۹
؎۲ خط نمبر ۱۳ ص ۳۳۲

سے مل لیتا ہے۔ باقی گھر کا دروازہ بند کیے بیٹھا رہتا ہے۔ گاہ
گاہ نہ ہر شام و بیگاہ غالب علی شاہ درویش کے تکیہ پر آجاتا
ہے۔ اہل شہر حیران ہیں کہ کھاتا کہاں سے ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ
یہ باپ سے پھر گیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ بے سبب باپ کی
نظروں سے گر گیا ہے۔ دیکھئے انجام کار کیا ہو۔ غالب علی شاہ
کا قول یہ ہے کہ کل کا بھلا ہو۔"

خط نمبر ۴ مورخہ ۲۶ جولائی ۱۸۶۵ء میں یہ غزل " میں ہوں مشتاق جفا مجھ پہ جفا اور سہی" بھیجی ہے اور تالیف قلب کی خاطر علائی کا ذکر کیا ہے کہ اس نے لکھوائی ہے اور تمہارے لیے لکھوائی ہے تاکہ علائی کے متعلق یہ احساس پیدا کیا جا سکے کہ وہ تمہارا کس قدر خیال رکھتا ہے۔ اب خط زیر بحث میں بھی یہی امر دیکھئے فرخ مرزا بچہ ہے اور یہ نفسیاتی بات ہے کہ انسان بچے سے بہت محبت کرتا ہے۔ بالخصوص دادا پوتے کو بہت پیار کرتا ہے۔ میرزا فطرت انسانی کے بہت بڑے نباض تھے۔ انہوں نے نفسیاتی ژرف نگاہی سے کام لے کر فرخ مرزا کو بہانا بنا یا اس کی گفتگو پیش کر کے باپ بیٹوں میں صفائی کرانے کی کوشش نہایت ہی عمدہ پیرایہ میں کی ہے۔ خط کا یہ حصہ قابلِ غور ہے۔

" پرسوں فرخ مرزا آیا، اس کا باپ بھی اس کے ساتھ تھا۔ میں نے
اس سے پوچھا کہ کیوں صاحب میں تمہارا کون ہوں اور تم میرے
کون ہو۔ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا کہ حضرت آپ میرے دادا اور میں آپ
کا پوتا ہوں۔ پھر میں نے پوچھا کہ تمہاری تنخواہ آئی؟ کہا، جنابِ
عالی آکا جان کی تنخواہ آگئی ہے، میری نہیں آئی۔ میں نے
کہا تو لوہارو جاتے تو تنخواہ پاتے۔ کہا کہ حضرت میں تو آکا جان
سے روز کہتا ہوں کہ لوہارو چلو، اپنی حکومت چھوڑ کر دلی کی
رعیت میں کیوں مل گئے۔
سبحان اللہ بالشت بھر کا لڑکا اور یہ فہم درست اور طبع سلیم۔
میں اس خوبی خو اور فرخی سیرت پر اس کو فرخ سیر کہتا ہوں۔

مصاحب بے بدل ہے. تم اس کو بلا کیوں نہیں بھیجتے۔ مگر بھائی غلام حسین خاں مرحوم کے متبع ہو کہ زین العابدین وحید رحسن اوران کی اولاد کو کبھی منہ نہ لگایا. علاؔ الدین خاں جیسا ہوش مند و ہمہ دان بیٹا فرخ سیر جیسا دانشور، بذلہ سنج اور شیریں سخن پوتا۔ یہ دو عطیۂ عظمٰے و موہبت کبریٰ ہیں تمہارے واسطے من جانب اللہ۔"

" اگر دریافتی بر دانشت بوس وگر غافل شدی افسوس افسوس"

آج ۲۲ جون کی ہے آفتاب سرطان میں آگیا. نقطہ انقلاب صیفی ہیں دن گھٹنے لگا. چاہیئے کہ تمہارا غیض و غضب ہر روز کم ہوتا جائے۔"

خط کی عبارت صاف بتا رہی ہے کہ اس خط کا تعلق خط نمبر ۳ سے ہے رہا فرخ مرزا کی گفت گو کا اندراج ـ اس کے متعلق پہلے عرض کر چکا ہوں کہ غالب نے نفسیات شناسی سے کام لے کر اس طریقۂ خطاب و طرز وکالت کو اختیار کیا ہے. تاکہ بچے کی باتوں پر محبت جوش میں آئے اور صلح وصفائی ہو جائے. اس وقت فرخ مرزا کی عمر چار سال سے زائد تھی. اس عمر کا بچہ اگر ذہین ہو تو اس قسم کی باتیں اس سے کچھ بعید نہیں ہیں. باپ بیٹوں میں شکر رنجی باقی رہی. آخر کار ستمبر کے مہینہ میں باپ بیٹوں کی صلح ہوئی. یکم اکتوبر ۱۸۶۵ء کو علائی کو صلح کی مبارکباد اس طرح دی ہے:

شکر ایزد کہ ترا با پدرت صلح فتاد
حوریاں رقص کناں ساغر شکرانہ زدند
قدسیاں بہر دعاے تو والا پدرت
قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند [له]"

یہ تمام خطوط واقعاتی تسلسل کے حامل ہیں. اور ایک دوسرے سے مربوط ہیں. ان ہی شواہد کی بنا پر یہ خط میرے نزدیک ۲۲ جون ۱۸۶۵ء کا ہے اور ترتیب

[له] خط ۴۶ ص ۹۹۔

میں اس کا چوتھا نمبر ہے ۔ ۱۸۶۷ کا نہیں ہے ۔ کیونکہ اس زمانے میں علائی دہلی میں نہ تھے ۔ اور غالب سے اٹھنا بیٹھنا دشوار تھا ۔ (ملاحظہ ہو خط نمبر ۲۳ بنام سیاح (ص ۴۴۹)، مورخہ ۱۱ جون ۶۷) اس کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ غالب ناتواں پر کیا گزر رہی تھی۔

ان چھ خطوں کے علاوہ دو خط نقوش کے مکاتیب نمبر میں شائع ہوتے ہیں پہلے خط پر مارچ ۱۸۶۷ درج ہے اور دوسرے خط پر کوئی تاریخ درج نہیں ۔ مختار الدین آرزو نے ۱۸۶۲ – ۱۸۶۴ زمانہ تحریر متعین کیا ہے ۔ لیکن تعین تاریخ کا کوئی خاص قرینہ نہیں پایا جاتا ۔ صرف کلیات نثر کے ذکر کو اساس قرار دے کر قیاس کیا جاسکتا ہے ۔ کلیات کے متعلق غالب لکھتے ہیں :

> " بھائی سے دو سوال ہیں ۔ ایک تو یہ کہ مجموعہ نثر کے خاتمہ کو کیا کروں ۔ وہ مبنی تھا اس حقیقت پر کہ نول کشور نواب ضیا الدین خاں سے واسطے انطباع کے لے گیا ۔ جب یہ واقع نہ ہوا تو اب اس کو نکال ڈالوں اور اس کی جگہ جو کئی نثریں اور رہیں وہ لکھ دوں ۔"[1]

حقیقت یہ ہے کہ منشی نول کشور آخر نومبر ۱۸۶۳ کو دہلی پہنچے ۔ خط نمبر ۳۳ بنام علاء الدین خاں مورخہ ۱۳ دسمبر ۱۸۶۳ میں ان کی آمد مذکور ہے اور خط نمبر ۳۲ مورخہ ۲۳ دسمبر ۱۸۶۳ میں ان کی روانگی کو چار پانچ دن کا عرصہ بتایا ہے ، گویا وہ سات یا آٹھ دسمبر ۶۳ کو دہلی سے روانہ ہوتے اور کلیات نثر اپنے ہمراہ طباعت کے لیے لے گئے ۔ اس لیے یہ خط ۱۸۶۳ کا نہیں ہوسکتا ۔ اب اگر کلیات نظم کی طباعت کے عرصہ کو پیش نظر رکھا جائے ، تو غالب کم از کم ایک سال بعد اس کی طباعت سے مایوس ہوتے ہوں گے ۔ اس لیے یہ خط ۱۸۶۴ کے بعد کا ہوسکتا ہے ، پہلے کا نہیں ۔ حالانکہ کلیات نثر پہلی بار جنوری ۱۸۶۸ مطابق رمضان ۱۲۶۴ھ میں شائع ہوا[2] گویا پانچ سال بعد اس کی طباعت مکمل ہوئی ۔

---

[1] ذکر غالب ص ۱۲۴ ۔

کلیات نثر میں ایک خط بنام غلام بابا سورتی شنبہ ہفتم مئی ۱۸۶۴ء کا موجود ہے۔ اس کے یہ معنیٰ ہوتے کہ ۱۸۶۴ تک غالب کلیات نثر میں خود اضافہ کرتے رہے۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ کم از کم ۱۸۶۴ میں طباعت سے ناامید نہیں ہوتے ہوں گے۔ البتہ ۱۸۶۵ کا کچھ عرصہ گزرنے پر ناامید ہوتے ہوں گے جیسا کہ خط زیر بحث سے ظاہر ہے۔ پس یہ خط ۱۸۶۵ کا ہو سکتا ہے یا اس کے بعد کا قرار دیا جا سکتا ہے۔ مختار الدین آرزو کا متعینہ عرصہ درست نہیں ہے۔ امور مندرجہ بالا کی روشنی میں اب امین الدین کے جملہ خطوط کی تاریخیں اور ترتیب حسب ذیل ہوگی۔

خط نمبر ۱۔ بھائی صاحب ساٹھ برس سے الخ۔ ۱۱ تا ۱۵ اگست ۱۸۵۸ء

خط نمبر ۲۔ اخ کرم کے خدام الخ۔ یوم الخمیس ۱۷ محرم ۱۲۸۱ھ مطابق ۲۳ جون ۱۸۶۴ء

خط نمبر ۳۔ برادر صاحب جمیل المناقب الخ جمعہ ۲۶ مئی ۱۸۶۵ء

خط نمبر ۴۔ جمیل المناقب عمیم الاحسان الخ ۲۲ جون ۱۸۶۵ء

خط نمبر ۵۔ برادر صاحب جمیل المناقب الخ چہار شنبہ ۲ ربیع الاول ۱۲۸۲ھ مطابق ۲۶ جولائی ۱۸۶۵ء

خط نمبر ۶۔ بھائی سے دو سوال الخ۔ ۱۸۶۵ء (مطبوعہ نقوش مکاتیب نمبر)

خط نمبر ۷۔ بھائی صاحب آج تک الخ۔ ۱۵ نومبر ۱۸۶۶ء۔

خط نمبر ۸۔ اے میری جان کس وقت الخ۔ ۳ مارچ ۱۸۶۸ء (مطبوعہ نقوش مکاتیب نمبر)

میرے پیش نظر تاریخی ترتیب کا ایک اور پہلو ہے۔ یعنی جملہ خطوط کو بلحاظ مکتوب الیہم بلحاظ سنین مرتب کیا جاتے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ واقعات میں تسلسل قائم ہو سکتا ہے۔

■■

حسن عسکری پلکھنوی

غالب خیام کے رنگ میں

خیام ایک مصور تھا، پیچ و تاب زندگی کی تصویریں کھینچنے والا۔ یہ اس کا ایک انداز خاص تھا، فہم و وہم کی کہانی سنانے کا۔ اس نے اس طرح جو کچھ سنایا اس کی فنی اور فکری تائید بہت سے اونچے فنکاروں نے کی ہے، جن میں سے ایک غالب بھی ہیں۔ غالب نے خیام کے بعض تصورات کو اپنی شاعرانہ خصوصیت کے رنگ میں ڈبو کر اس طرح اپنایا ہے کہ فنی ترقی کا تصور رسمی زبان درازیوں میں گم نہیں ہوا۔

فن ایک کمینگاہ ہے عقیدہ پرست عوام کی۔ سادہ لوحی سے چھیڑ چھاڑ کرنے کے لیے یہ ایک ایسا نکتہ ہے جس سے خیام اور غالب کے کچھ خاص تصورات کی اہمیت بہت کچھ واضح ہو جاتی ہے مثلاً

خیام:

گویند کہ فردوس بریں خواہد بود
آن جا مئے ناب و حور عین خواہد بود
گر ما مے و معشوق گزیدیم چہ باک
چوں عاقبت کار چنیں خواہد بود

عقائد عوام کی انفرادی و اجتماعی ہلچلوں کا محور ہوتے ہیں۔ ان کے ذریعے سے اکثر قوموں اور جماعتوں کے رگ و پے میں زندگی کی لہریں دوڑائی گئی ہیں۔ لیکن کبھی کبھی یہ فکر و نظر کے دشمن بھی ثابت ہوتے ہیں۔ لہٰذا خیام نے اس رباعی میں جو استدلال پیش کیا ہے وہ ایک رند بے مشرب کا بے تکا راگ نہیں ہے بلکہ

اس کی علم دوست نگاہیں لوگوں سے فکر ونظر کو کام میں لانے کا مطالبہ کر رہی ہیں۔
اس مضمون میں کچھ اور اضافہ ملاحظہ ہو:

خیام:

یک شیشہ شراب ولب یار ولب کشت
ایں جملہ مرا نقد وترا نسیہ بہشت
تو مے بہ بہشت و دوزخ اندگرہ
کہ رفت بدوزخ وکہ آمد زبہشت

اس رباعی میں علم وعقیدہ کا ایک انتہائی لطیف تصادم دیکھنے میں آتا ہے۔ اور کتنی تیزی کے ساتھ خیام کے تصورات ایک فرد کے چھوٹے سے ماحول سے نکل کر پوری انسانیت کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتے ہیں۔ مگر ہاں ان سے عقائد کے بنائے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھروندوں کو ضرور ٹھیس پہونچتی ہے۔ اس قسم کے مضامین نکتہ رس غالب کے یہاں ملاحظہ ہوں۔

غالب:

جنت نکند چارۂ افسردگی دل
تعمیر بہ اندازۂ ویرانی ما نیست

ایک تمدن کی گرتی ہوئی دیواروں کی ڈراؤنی آوازوں کا ایک حساس اور سمجھدار انسان پر کہاں تک اثر نہ ہو؟ زوال وجمود کی فضا میں ہر انسان ان عقائد سے بڑی امیدیں باندھ لیتا ہے جو بچپن سے اس کے دماغ میں جگہ پاتے ہوتے ہیں۔ لیکن امیدوں کا ناامیدیوں میں بدل جانا ان عقائد کی وقعت کو کچھ نہ کچھ ضرور کم کر دیتا ہے، لہٰذا یہ شعر غالب کے ماحول کی ایک ایسی تصویر ہے جس سے اس دور کی مایوس کن زندگی کا کافی پتہ لگ جاتا ہے۔ مگر دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ غالب نے اس بہت بڑی کیفیت کو ہنر سے اس طرح نوازا ہے کہ تقلید و تخلیق دونوں زندگی کی آغوش میں نظر آتی ہیں۔ اس انداز میں ایک دوسری جگہ وہ اپنے کو مصور فطرت کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔

رنگہا چوں شد فراہم مصرفے دیگر نداشت
خلد را نقش و نگار طاق نسیاں کردہ ایم

فطرت کے بعض مطالبوں کے لیے پیدا ہونے والے ذوق پردہ داری نے افسانۂ گناہ کو ایجاد کیا ہے۔ اس کے ذریعے سے انسان نے اشتعال تصادم سے بچنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے جس کی حدود قائم کرنے میں بعض طبقوں نے اس قدر مبالغہ سے کام لیا ہے کہ خالی تصور گناہ ذہن انسانی کے لیے ایک بوجھ بن گیا ہے۔ اس بوجھ کے اتار پھینکنے کے لیے فطرت کی باغیانہ ہلچلیں اکثر دیکھنے میں آتی ہیں۔ یعنی اٹھتی ہوئی جوانی میں ہر انسان اپنے فطری مطالبوں کے پورا کرنے کی دھن میں نہ معلوم کن کن چیزوں کو بھلا بیٹھتا ہے۔ غالب نے اسی کیفیتِ نفس کو "خلد را نقش و نگار طاق نسیاں کردہ ایم" کی پھبتی میں پیش کیا ہے جس کو خالی مبالغہ نہیں کہا جا سکتا ہے۔

غالب:

در مژدہ ز جوئے عسل و کاخ زمرد
چیزے کہ بہ دلبستگی ارزد مے نابست

غالب بادہ خوار، غالب بادہ پرست، اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ انھوں نے محبت بادہ کی کہانی کو نظم تو کیا نثر میں بھی سنایا ہے اور اس طرح سنایا ہے کہ ان کی روح تھرکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور اس شعر میں بھی بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ شراب سے جوان کو رغبت تھی اس کو خوب بڑھا چڑھا کر بیان کر رہے ہیں۔ لیکن یہ بات نہیں ہے۔ جنت کی خیالی تصویر جو کہ شاعرانہ خصوصیات سے بھری ہے، عوام کو نیکیوں کی جانب کھینچنے کے لیے پیش کی گئی ہے۔ چونکہ اس طبقہ کو خشک فلسفیانہ انداز میں کسی حقیقت کا سمجھانا بڑا مشکل ہے۔ لیکن عوام تو عوام اکثر ماہرین دینیات بھی اس نکتہ پر ذرا ترقی یافتہ ڈھنگ سے سوچنے کے لیے آمادہ نہیں پائے جاتے۔ یعنی عوام کو اور خواص کو وہ ایک ہی انداز سے تبلیغ کرنے لگتے ہیں اور عقلی سعادت جو نیکیوں کا سرچشمہ ہے اس کی جانب ان کی نظر قطعی نہیں

جاتی۔ لہٰذا اس شعر میں اس کمی کی جانب بڑی خوبصورتی کے ساتھ اشارہ کیا گیا ہے۔ اور نکتہ رغبت کو پیش کر کے فطرت کی ان حاکمانہ خصوصیات کی تصویر کھینچ دی ہے جن میں دماغوں کو کھینچنے کی بہت بڑی صلاحیت ہوتی ہے۔ اب پھر خیام کی کچھ رباعیاں ملاحظہ ہوں:

خیام:

یزداں کہ گل وجود ما آراست
دانست زفعل ما چہ برخواہد خاست
بے حکمش نیست ہر گناہیکہ مراست
پس سوختن قیامت از بہر چہ خواست

کس قدر سادگی اور بے باکی سے کہتا ہے، وہ خدا جس نے کہ میرے گل وجود کو آراستہ کیا ہے وہ میرے ہر فعل سے واقف ہے اور جب وہ میرے وجود کا سبب ہے تو میری ہر ہلچل کا سبب بھی وہی ہوا۔ پھر قیامت میں جلنے کا سوال کیسا؟

خیام ایک بڑا اچھا تنقیدی مذاق رکھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کسی فرد یا قوم کی ذہنی و جسمانی ہلچلوں کا کسی خاص نقطہ پر ٹھہر جانا احکامات فطرت کی بہت بڑی نافرمانی ہے۔ لہٰذا اس نکتے کو سمجھانے کے لیے خیام نے کہیں بیباک ظرافت کا رنگ اختیار کیا ہے کہیں بہت ہی نرم گدگدیوں سے کام لیا ہے۔ مثلاً

خیام:

من بندۂ عاصیم رضائے تو کجاست
در کنج دلم نور و ضیائے تو کجاست
مارا تو بہشت اگر بطاعت بخشی
این بیع بود لطف عطائے تو کجاست

کس قدر لطیف پیرایۂ بیان ہے کہ زبردست سے زبردست استبداد کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ آئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یعنی تو مجھے بہشت اگر بندگی سے بخشے گا

تو یہ ایک طرح کا بیعنامہ ہوا۔ اس میں تیری مہربانی کا شائبہ کہاں ہوا۔ ایک آزاد فکر ایک بہت بڑے تصور کو ایک ایسے فنی سانچے میں ڈھال رہی ہے جس کی عمر بہت دراز ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عبادت انسان کے لیے ایک بہت ضروری شے ہے۔ اس سے نفس انسانی میں ایک ایسا سوز و گداز پیدا ہوتا ہے جس سے انسان دوسروں کے لیے مرنا جینا سیکھتا ہے۔ اس کے اچھے اثرات سے اس دنیا میں ہمیں بہت کچھ ملتا ہے۔

خیام:

ناکردہ گناہ درجہاں کیست بگو
واں کس کہ گنہ نہ کرد چوں زیست بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دہی
پس فرق میاں من و تو چیست بگو

ناکردہ گناہ کے کرنے کی حسرت ملاحظہ ہو۔ اور دوسرے مصرعے میں ایک ایسی حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ اس کی تحلیل کی جائے اور باریک اجزا سے گناہ کو تلاش کیا جائے تو کوئی انسان کمیوں اور غلطیوں سے خالی نہیں پایا جاسکتا۔ تیسرے چوتھے مصرعے میں سزا اور جزا کے مسئلہ کی تنقید کا کیا پیارا ڈھنگ ہے یعنی میں نے برا کام کیا تو نے بری سزا دی۔ دونوں کا دامن برائی سے سن گیا (خدا سے خطاب ہے) پھر مجھ میں اور تجھ میں کیا فرق رہ گیا۔ حالانکہ میرا اور تیرا کوئی مقابلہ ہی نہیں میں تو تیرا ہی بنایا ہوا ہوں۔ اسی طرح سے بھلائی اور برائی کا ایک اور تصور ملاحظہ ہو:

خیام:

چوں بادہ خوری ز عقل بیگانہ مشو
مدہوش مباش و جہل را خانہ مشو
خواہی کہ مے لعل حلالت باشد
آزار کسے مجوئے و دیوانہ مشو

ان فنی چٹکیوں کے ذریعے سے عقلی سعادت کی تبلیغ مقصود ہے۔ اور بھلائی برائی کے رسمی اور ادنیٰ تصورات سے انسان کو آگے بڑھانے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ سمجھایا گیا ہے کہ ہر وہ کام برا ہے جس کے ذریعے سے ایک انسان دوسرے انسان کی دل آزاری کا خواب دیکھے۔ خیام کی ان رباعیوں کو پیش نظر رکھتے ہوتے غالب کے کچھ اور اشعار ملاحظہ ہوں۔

غالب:

کاے خس شعلہ آواز موذن زنہار
از پئے گرمیٔ ہنگامہ منہ دل بہ خروش

یعنی اے خس شعلہ آواز موذن گرمیٔ ہنگامہ کے لیے میرے دل میں خروش مت کر اس کا کوئی اچھا نتیجہ نہیں ہے۔ یعنی جو عبادت مسلسل انسان کے کردار پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالتی ہے اس کا کرنا نہ کرنا برابر ہے۔ اس سے انسان کے سامنے آنے والی مشکلوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہو گی۔

غالب:

یارب بزاہداں چہ دہی خلد رائیگاں
جور بتاں ندیدہ و دل خوں نکردہ کس

کیا پیاری شکایت ہے۔ آپ خدا سے کہہ رہے ہیں کہ ان زاہدوں کو تو نے جنّت بلا وجہ دی، اس لیے کہ انہوں نے تو کبھی معشوق کے ظلم و جور کو دیکھا بھی نہیں۔ لہٰذا جنّت میں جو حور و غلمان ہیں ان کے ناز و غمزہ کو یہ کس طرح برداشت کریں گے۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلے گا کہ یہ نہ ان سے خوش ہو سکیں گے اور نہ وہ ان سے خوش ہو سکیں گے۔ کس قدر لطیف تنقیدی نکتہ ہے۔

غالب:

از جنّت و سرچشمہ کوثر چہ کشاید
خوں گشتہ دل و دیدۂ خوں خانہ فشاں ہائے

ہر قسم کی مایوسیوں اور ناامیدیوں سے گھرے غالب کی دلجوئی کون کرے۔

اس میں شک نہیں کہ جب انسان کے دماغ پر فکری دباؤ ہوتا ہے تو دائرہ فطرت سے باہر ہو کر سوچنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا۔ اگر اسے کوئی افسانوی بہلاوا دینے کی کوشش بھی کی جاتی ہے تو اس کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اسی تصور کو غالب نے یوں پیش کیا ہے کہ میرے خون ہو جانے والے دل اور خون برسانے والی آنکھوں پر جنت و کوثر کی افسانہ خوانی کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔

غالب،

در بادہ طہور غم محتسب کجا
در عیش خلد لذت بیم زوال کو

ان کی ندرت آرزو کسی طرح پیچھا نہیں چھوڑتی۔ یعنی آپ کی شکایت ہے کہ جنت میں بادہ طہور تو ملے گا لیکن غم محتسب تو نہیں ملے گا اور جنت میں عیش مسلسل ہے، زوال کے خوف کی لذت کہاں؟ یہ وہ فطری حقیقتیں ہیں جن سے ہر انسان آتے دن متاثر ہوتا رہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ رنج و راحت کے اتار چڑھاؤ میں جو لطف ہے وہ عیش مسلسل میں قطعی نہیں ہے۔

غالب،

صحبت بہ گوناگوں اثر غالب چہ خسپی بے خبر
نیکاں بہ مسجد رفتہ و رندان بگلشن گشتہ جمع

یہاں پہ وہ تمدن کے ان باریک نکتوں پر غور کر رہے ہیں جن کے ذریعے سے انسان کو کچھ ایسی تکلیفوں کے برداشت کرنے کے لیے آمادہ کیا گیا ہے جن سے اس کی فکری نشوونما ہو۔ یعنی وہ صبح جو کہ ایک مظہر قدرت ہے۔ اس کے یہ مختلف اثرات کیوں دیکھنے میں آتے ہیں کہ نیک لوگ تو مسجد کی طرف جاتے ہوئے نظر آتے ہیں اور رند گلشن میں جمع ہوتے نظر آتے ہیں۔ یہ سب ان کے نزدیک ذہن انسانی کا دستوری نشیب و فراز ہے جس پر انساں کو انتہائی

سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

غالب:

اے آنکہ دہی مایہ کم و خواہش بیش
آں روز کہ وقت باز پرس آید پیش
بگزار مرا کہ من خیالے دارم
با حسرت عیش ہائے ناکردہ خویش

غالب کی جرأت رندانہ اور سوال کرنے کے ڈھنگ بعض مقامات پر تو بالکل خیام سے ملتے جلتے نظر آتے ہیں اور لذت گناہ سے خیام کی طرح ان کی طبیعت سیر ہوتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ لہذا فلسفہ گناہ کی باریکیوں پر غالب کی نظر بھی اسی طرح جاتی ہے جس طرح خیام کی۔

غالب:

اے دادہ بباد عمر، لہو فسوس
زنہار مشو ز رحمت حق مایوس
ہشدار کزآتش جہنم، حق را
تہذیب غرض بود، نہ تعذیب نفوس

اس رباعی میں مذہب کے اس افسانوی ادب کی تنقید ہے جس میں خوف دلا کر انسان کو برائیوں کی طرف جانے سے روکا گیا ہے۔ اس کے متعلق وہ سمجھا رہے ہیں کہ اس سے انسان کی تہذیب نفس مقصود ہے نہ کہ اسے تکلیف دینا۔ آخر میں ان کی ایک رباعی اور پیش کی جاتی ہے جس میں انہوں نے اس رنگ میں بہت وسیع مضمون باندھا ہے۔

غالب:

یارب بجہانیاں دل خرم دہ
در دعوئے جنت آشتی باہم دہ

شداد پسندداشت باغش ازتست
آں مسکنِ آدم بہ بنی آدم دہ

فنی تخلیق و ترقی کا سب سے بڑا درجہ یہ ہے کہ انسان پوری انسانیت کو اپنے فن کے ذریعے سے کچھ دے سکے۔ خیام نے پوری انسانیت کو خطاب کیا ہے مگر ہم غالب کو بھی پوری انسانیت کو خطاب کرتے ہوتے دیکھتے ہیں۔ اس رباعی میں وہ پوری دنیا کے لیے ایک شاد کام دل مانگ رہے ہیں اور جنت کا دعویٰ کرنے والوں کے لیے وہ باہمی صلح و آشتی کے خواہاں ہیں اور آگے حضرت آدم کی تلمیح کی جانب اشارہ کرتے ہوتے کہہ رہے ہیں کہ وہ آدم جس کو تو نے جنت میں پیدا کیا تھا۔ اس کی اولاد اس باغ کو کھو بیٹھی ہے۔ لہٰذا اس مسکن آدم کو پوری آدم کی اولاد کو دے دے۔ یعنی یہ ایک ایسے مثالی کردار کی آرزو ہے جس سے دنیا کے تمام جھگڑے ختم ہو جائیں۔ یہاں پر غالب مذہب انسانیت کے پیغامبر نظر آتے ہیں۔ انہوں نے ایرانی ادب کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ وہ تنقید کا بڑا ملکہ رکھتے تھے۔ وہ ہندوستانی ماحول میں بلحاظ اردو ادیب اور شاعر ایک بے مثل جدت و تخلیق کے مالک ہیں۔ لیکن ایرانی فکر و نظر کے اعتبار سے ان کو پرکھا جاتے تو مایہ ناز اساتذہ کے ہم نوا بننے کی آرزو نے انہیں اس درجہ اونچا اٹھایا ہے کہ وہ شاعر زندگی یا شاعر انسانیت ہو گئے۔ وہ تصورات کی قطع برید اور ان کو ترقی سے نوازنے کے ایک ایسے انداز سے واقف تھے جس میں رنگ ہے، بو ہے، زندگی ہے۔

■■

مرتضیٰ حسین

غالب اور قید

غالب ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء کو زبان و قلم و ذہن کی کاوشوں سے سبک دوش ہوئے لیکن اہل قلم کو نئی شاہراہ پر لگا گئے۔ غالب سے پہلے اردو کے کسی شاعر پر اتنی شرح و بسط کے ساتھ قلم فرسائی نہیں ہوئی۔ بلکہ یہ کہنا بھی حقیقت کے خلاف نہ ہوگا کہ غالب کے بعد بھی اتنی موشگافیاں اور زحمتیں کسی دوسرے کے لیے نہیں برداشت کی گئیں۔ "شخصی تنقید" کے لیے سب سے پہلے غالب ہی اردو میں موضوع قرار پاتے۔ اور شاید ہی ایسا کوئی گوشہ ہو جس پر اہل نظر و قلم کام نہ کر چکے ہوں۔

"سبد چین" میں غالب کی ایک نظم جو "حبسیہ" کے نام سے مشہور ہے، شائع ہوئی ہے۔ میں نے اس کتاب پر کچھ لکھنا چاہا تو غلام رسول مہر کی کتاب "غالب" میں اس نظم سے متعلق واقعے پر بہت کچھ پایا۔ اس کے بعد "یوسف ہندی قید فرنگ میں" ایک چھوٹا سا رسالہ نظر سے گزرا۔ لیکن واقعہ کے بہت سے جزئیات ان دونوں کتابوں کے علاوہ بھی ملے۔ دل چاہا کہ اس سلسلہ کی سب کڑیاں جمع کر دی جائیں لہٰذا۔

خواہم از بزم بزندان سخن آغاز کنم

۵۷ء سے پہلے دلی عیش پرستی کا مرکز تھی۔ حکومت کمزور، انگریز طاقت ور، ہندوستانی مست، بے حسی اور کسمپرسی کی حالت میں چاروں طرف رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ رئیس زادے اوباش منش لوگوں میں بیٹھ کر اپنی فطرت بدل چکے تھے۔ بڑی بڑی حویلیاں جوئے بازی کے اڈوں کے کام آ رہی تھیں۔

محبوب علی خواجہ سرا کے زیر اہتمام دلی کے روسا جمع ہو کر جوا کھیلتے تھے۔ اور ہزاروں کی رقمیں بہنگیوں میں رکھ کر یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں آتی تھیں۔

مرزا کی جوانی دیوانی تو تھی ہی جہاں اور گلیوں کی خاک اڑاتی تھی، یہ کوچہ کیوں چھوٹتا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مرزا کلکتہ سے پلٹ چکے تھے۔ نواب شمس الدین خاں بھی قتل ہو چکے تھے اور ہر چھوٹا بڑا مرزا کا دشمن ہو رہا تھا۔

اپریل یا مئی ۱۸۴۷ء میں فیض الحسن خاں کوتوال ایک پردہ دار رتھ میں بیٹھ کر مرزا کے گھر پر چھاپہ مارنے آئے۔ دروازے پر روکے گئے تو یہ کہہ کر اندر داخل ہوئے کہ "کچھ زنانی سواریاں ہیں"۔ کوتوال صاحب گھر میں پہنچے تو مجمع بھاگا۔ عاصی کے بیان کے مطابق "جوتوں سے زدوکوب ہوئی" اور بہت غلط طریقے سے لوگ گرفتار ہوئے۔ مرزا صاحب بھی اسی زد میں آ گئے۔

میرزا حیرت نے لکھا ہے کہ مرزا صاحب کے ساتھ بہت رعایت کی گئی۔ کسی قسم کی توہین نہیں ہوئی اور کسی نے انہیں ہاتھ نہیں لگایا۔ بلکہ ضمانت پر رہا کر دیئے گئے۔ (چراغ دہلی ۔۔۔ ص ۳۲۷) مہر صاحب نے کوتوال کو مرزا کا مخالف بتایا ہے لیکن مرزا حیرت کے بیان کے بعد مہر کا بیان مشکوک ہو جاتا ہے۔

مقدمہ دائر ہوا، اور "احسن الاخبار" کی خبر کے مطابق (۱۵ جمادی الثانی ۲۵ جون ۱۸۴۷ء) ریذیڈنٹ (معظم الدولہ) کے نام بہادر شاہ نے سفارشی خط لکھا لیکن جواب دیا گیا کہ:

"مقدمہ عدالت کے سپرد ہے۔ ایسی حالت میں قانون سفارش کی اجازت نہیں دیتا۔" جون کا مہینہ مقدمہ میں گزر گیا۔

مقدمہ کا فیصلہ

کنور نوروز علی خاں مجسٹریٹ دہلی باوجودیکہ غالب کے دوست تھے لیکن مزاج کے سخت تھے چنانچہ فیصلہ میں مرزا کو ملزم قرار دیتے ہوئے چھ مہینے کی سزا و جرمانہ کر دیا۔ احسن الاخبار، ۲ جولائی ۱۸۴۷، ۲۲ جمادی الثانی ۱۲۶۳ھ میں فیصلہ شائع ہوا۔

"مرزا صاحب کو چھ مہینے کی قید بامشقت اور دو سو روپے جرمانہ کی سزا ہوئی۔ اگر وہ دو سو روپے جرمانہ ادا نہ کریں

تو چھ مہینے قید میں اور اضافہ ہو جاتے گا۔ مقررہ جرمانہ کے علاوہ
اگر پچاس روپے زیادہ ادا کیے جاتیں تو مشقت معاف
ہو جاتے گی۔"

فیصلہ سخت تھا اور پبلک کے نزدیک مرزا کی بیماری اور بے قصوری کے بعد اتنی بڑی سزا ظالمانہ تھی، لہٰذا اخبار میں احتجاج کیا گیا کہ:

"جب اس بات کا خیال کیا جاتا ہے کہ مرزا صاحب عرصے
علیل رہتے ہیں، سوائے پرہیزی غذا قلیہ چپاتی کے اور
کوئی چیز نہیں کھاتے تو کہنا پڑتا ہے کہ اس قدر مصیبت اور
مشقت کا برداشت کرنا مرزا صاحب کی طاقت سے باہر ہے
بلکہ ہلاکت کا اندیشہ ہے۔"

یہ بات عدل وانصاف کے بالکل خلاف ہے کہ ایسے باکمال رئیس کو جس کی عزت وحشمت کا دبدبہ لوگوں کے دلوں میں بیٹھا ہوا ہے، معمولی سے جرم میں ایسی سخت سزا دی جاتے جس سے جان جانے کا قوی احتمال ہے۔"

بہر حال سزا ہو گئی اور غالب قید میں پہنچے اور یہ کہتے ہوتے:

پاسباناں بہم آئید کہ من می آیم
در زنداں بکشائید کہ من می آیم

منشی گھنشام رام عاصی نے تاریخ کہی:

سرِ ابجد سے فصلی میں تو سب اظہار طوفاں ہے[1]
اور اٹھارہ سو سینتالیس میں قید غریباں ہے

قید خانہ

دہلی سنٹرل جیل جو پہلے بھولی بھٹیاری یا بختیاری کی سرائے کے نام سے

---

[1] ۱۲۵۴ ف

مشہور تھی اور ۶۰ء کے بعد انگریزی حکومت نے اس کو قید خانہ بنایا تھا۔ غالب یہیں قید ہوتے۔ ایک کوٹھری انہیں دی گئی تھی جس میں بقول حالی گھر سے آیا ہوا کھانا اور کپڑا مل جاتا تھا۔ لیکن مرزا کے "بند" سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انتظام جیل ہی کی طرف سے ہوتا تھا۔

شادم از بند کہ از بند طعام آزادم
از کف شحنہ رسد جامہ و نانم در بند

یہ کوٹھری تاریک، بوسیدہ اور غیر ہوادار تھی۔

لرزم از خوف دریں حجرہ کہ از خشت و گل است
ورنہ در دل خطر از کام نہنگم نہ بود
آہ ازیں خانہ کہ روشن نہ بود در شب تار
جز بداں خواب کہ در چشم نگہباں سوزد
شمع ہر چند بہر زاویہ آساں سوزد
خوشتر آں است کہ بر نطع در ایواں سوزد
آہ ازیں خانہ کہ در وے نہ تواں یافت ہوا
جز سمومیکہ خس و خار بیاباں سوزد

قید خانہ میں اور مجرم بھی تھے:

ہلہ زندان گرفتار و فانیست بہ شہر
خویشتن را بشما ہمدم و ہمراز کنیم

اہل جیل کی نگرانی و حفاظت کے لیے دو آدمی متعین تھے۔

زیں دو مرہنگ کہ پو تید بہم می ترسم
بیمے از شیر ہراسے ز پلنگم نہ بود

اس حالت میں تمام خاندان والوں نے مرزا کی قرابت سے انکار کر دیا تھا۔ احباب نے خبر گیری ترک کر دی تھی۔ صرف ایک مصطفیٰ خاں شیفتہ تھے جو ان کے خبر گیر تھے۔

مصطفیٰ خاں کہ دریں واقعہ غم خوار من است
گر بمیرم چہ غم از مرگ عزادار من است

تاثرات

مرزا کے لیے یہ واقعہ جتنا بھی روح فرسا ہو کم ہے لیکن ان کی فطرت انہیں دوسروں کے درد سے بیقرار کر دیتی تھی۔ وہ اپنا غم بھلا دیتے ہیں:

خوے تے خوش بہر مصیبت زدہ رنجے است دگر
رنجہ از دیدن رنج و گرانم دربند

اب رہے خود تو:

من نہ آنم کہ ازیں سلسلہ ننگم نہ بود
چہ کنم چوں بقضا زہرۂ جنگم نہ بود

مدت قید

جون کے آخر میں فیصلہ ہوا۔ جولائی، اگست، ستمبر یعنی رجب، شعبان، رمضان کے تین مہینے قطعاً جیل میں گزرے بلکہ غالب کی عید بھی وہیں ہوئی ہوگی۔

رفتہ دربارۂ من حکم کہ با درد دریغ
شش مہ از عمر گرامی گزرانم دربند
اگر این است خود آن است کہ عید الاضحیٰ
گزرد نیز چو عید رمضانم دربند

رہائی

ایک دن مسٹر راس صاحب سول سرجن دہلی قیدیوں کے معائنہ کے لیے تشریف لاتے۔ غالب سے بھی مزاج پرسی کی۔ مرزا صاحب نے فی البدیہہ کہا :

جس دن سے کہ ہم غمزدہ زنجیر بہ پا ہیں
کپڑوں میں جوئیں بخیہ کے ٹانکوں سے سوا ہیں

سول سرجن نے رہائی کی سفارش کی، مرزا صاحب رہا ہو گئے۔ مگر ذلت کا تصور ان کے لیے باعث خانہ نشینی ہوا اور وہ ایک عرصہ تک گھر سے باہر نہیں نکلے۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد میاں کالے صاحب نے دربار تک رسائی کرادی اور وہ "دبیر الملک، نجم الدولہ، نظام جنگ" جیسے عظیم القدر خطابات سے سرفراز ہوتے۔

دل چاہتا تھا کہ دوسرے بند بھی نقل کیے جاتیں لیکن ضرورت نہیں ہے لہٰذا آخری بند کے آخری دو شعر نقل کرتا ہوں :

ہفت بنداست کہ در بند رقم ساختہ ام
بنویسید و بخوانید و بہ بینید ہمہ
آں نہ باشم کہ بہ ہر بزم زمن یاد آرید
دارم امید کہ در بزم سخن یاد آرید

■■

پبلیکیشنز ڈویژن
وزارتِ اطلاعات و نشریات
حکومتِ ہند
ISBN : 81-230-0340-4